جولائی July 2024

ماہنامہ

صدائے شبلی

حیدرآباد

Urdu Monthly
SADA E SHIBLI
Hyderabad
ISSN: 2581-9216

ہزار برق گرے لاکھ آندھیاں اٹھیں
وہ پھول کھل کے رہیں گے جو کھلنے والے ہیں

زیر تعمیر عمارت مجوزہ نقشہ
شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد

ایڈیٹر مولانا ڈاکٹر محمد مجاہد ہلال اعظمی

قیمت: -/20 روپے
www.shibliinternational.com

ماہنامہ حیدرآباد

صدائے شبلی

Monthly Hyderabad

SADA E SHIBLI

Issue: 77 :شمارہ Vol: 7 :جلد July 2024 جولائی

ISSN: 2581-9216

مدیر:

ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نائب مدیران:

ڈاکٹر عبدالقدوس

ڈاکٹر سراج احمد انصاری

ابوہریرہ یوسفی

قیمت فی شمارہ:	20/-
سالانہ:	220/-
رجسٹرڈ ڈاک:	350/-
بیرونی ممالک:	50/-/امریکی ڈالر
خصوصی تعاون:	2000/-

SADA E SHIBLI
A/c: 1327102000023922
Ifsc: IBKL0001327
IDBI Bank: CHARMINAR HYD, T.S

Email: sadaeshibli@gmail.com

Mob: 9392533661 - 8317692718

ماہنامہ "صدائے شبلی" حیدرآباد میں مقالہ نگاران سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

مجلس مشاورت:

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی۔ پروفیسر مظفر علی شہ میری
پروفیسر محسن عثمانی ندوی۔ پروفیسر ابوالکلام
پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی۔ ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی
مفتی محمد فاروق قاسمی۔ مولانا ارشاد الحق مدنی
ڈاکٹر نادر المسدوسی، مولانا محمد مساعد ہلال احیائی
اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ۔ محمد سلمان انجینئر

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محمد رفیق۔ ڈاکٹر حمران احمد۔ ڈاکٹر ناظم علی
ڈاکٹر مختار احمد فردین۔ ڈاکٹر غوثیہ بانو
ڈاکٹر سید امام حبیب قادری۔ ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی
ڈاکٹر سمیہ تمکین۔ ڈاکٹر صالحہ صدیقی۔ ڈاکٹر نوری خاتون
ڈاکٹر فاروق احمد بھٹ۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان
ڈاکٹر آصف لئیق ندوی۔ ڈاکٹر مظفر علی ساجد۔
مولانا عبدالوحید ندوی۔ مولانا احمد نور عینی
ابوہریرہ ایوبی۔ محسن خان

ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف حیدرآباد کی عدالت میں ہوگی

محمد محامد ہلال (اونر، پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر) نے دائرہ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر حیدرآباد تلنگانہ سے شائع کیا

خط وکتابت کا پتہ

MOHD MUHAMID HILAL #17-6-352,
B1, 2nd Floor,Bafana Complex,
Dabirpura Road, Purani Haveli,
Hyderabad- 500023. T.S

فہرست مضامین

۱	اپنی بات	ڈاکٹر محمد حامد ہلال اعظمی	۵
۲	اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	علامہ شبلی نعمانیؒ	۶
۳	اصولِ درایت	مولانا عمر احمد عثمانی	۷
۴	منقبتِ حضرت امام حسینؓ	پروفیسر مظفر شہ میری	۹
۵	ہجرت کی انقلابی داستان اور سن ہجری کا پس منظر	حبیب اعظمی	۱۰
۶	اسلام میں مطلقہ خواتین کا نان ونفقہ اور سپریم کورٹ کا حالیہ فیصلہ	امداد الحق بختیار	۱۱
۷	**غزل**	فراز ادیبی	۱۵
۸	اٹھ! کہ پھر قائم کریں میزان عدل۔۔	عمارہ فردوس	۱۶
۹	**غزل**	شاعر خلیج جلیل نظامی	۱۸
۱۰	مدارس اسلامیہ کا خود کفیل ہونا مفید یا مضر	عبد العلیم الاعظمی	۱۹
۱۱	پری ناز اور پرندے ایک تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر ناظر حسین خان	۲۴
۱۲	غالب کے خطوط کی ادبی وتاریخی اہمیت	ڈاکٹر درخشاں عندلیب خان	۲۹
۱۳	صادقہ نواب سحر کی افسانہ نگاری	شاکرہ شیخ	۳۱
۱۴	بدلتے رُخ	سید عظمت اللہ بیابانی	۳۷
۱۵	**نظم**	فہیم اختر	۳۸
۱۶	پروفیسر خواجہ عمر کی علمی، ادبی، تعلیمی خدمات ناقابل فراموش..........	ڈاکٹر نادر المسدوسی	۳۹
۱۷	ماہر شبلیات ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی 'شبلی ایوارڈ' سے سرفراز	ادارہ	۴۰

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کے خصوصی معاونین

جناب **ابوسفیان اعظمی**، مقیم حال ممبئی

جناب **محمد یوسف** بن الحاج محمد منیر الدین عرف ولی مرحوم، حیدرآباد

مفتی **محمد فاروق قاسمی**، صدر علماء کونسل وجے واڑہ، آندھراپردیش

ڈاکٹر **سید جلیل حسین** ایم ڈی (علیگ) ٹولی چوکی حیدرآباد

مولانا **منصور احمد قاسمی**، معین آباد، تلنگانہ

الحاج **رئیس احمد اقبال**، انجینئر صدر سہارا ویلفیئر سوسائٹی، حیدرآباد

الحاج **محمد زکریا** انجینئر (داماد استاذ الاساتذہ حضرت عبدالرحمٰن جامیؒ)

ڈاکٹر **شہباز احمد**، پروفیسر گورنمنٹ نظامیہ طبی کالج چارمینار، حیدرآباد

مولانا **محمد عبدالقادر سعود**، نائس جوس سینٹر سکندرآباد، حیدرآباد

الحاج **محمد قمر الدین**، نبیل کالونی بارکس حیدرآباد

الحاج **محمد عبدالکریم**، صدر مسجد اشرف کریم گلشن باغ، حیدرآباد

اپنی بات

ماہ جولائی 2024 میں یوم عاشورہ رہا، 10 محرم الحرام یوم عاشورہ عالم میں مختلف ادوار کے حساب سے بڑی اہمیت کا حامل ہے، وہ اول وآخر ہے مگر انقلابی واقعہ کربلا نے یوم عاشورہ کے روشن ماضی پر پرت ڈال دی ہے، حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مظلومانہ شہادت نے قیامت تک کے لئے بے مثال نظیر پیش کی ہے، بقول محمد علی جوہر کے قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے، اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد۔

واقعہ کربلا سے ہم مسلمانوں کو ایک اہم سبق ملتا ہے کہ ہم کسی بھی حالت میں غلط طریقہ اور ظلم وظالم سے سمجھوتہ نہ کریں چاہے ہمیں اس کے لئے اپنی جان ہی کی کیوں نہ قربانی دینی پڑے، حق کے لئے جان قربان کر دینا شہادت ہے اور شہید زندہ ہوتا ہے۔ بقول شاعر ۔ روئیں وہ لوگ جو منکر ہیں حیات شہداء کے، ہم زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے۔ حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مظلومانہ فاتحانہ شہادت عین سجدے میں ہوئی، بقول شاعر کہہ رہا ہے کربلا کا ذرّہ ذرّہ آج بھی، سر کٹا سجدے میں تو دستار اونچی ہوگئی۔ پیغام ہے کہ مسلمان کو کسی بھی حالت میں نماز سے غافل نہیں ہونا چاہئے۔

ہمارے ملک میں عدالت نے مسلم مطلقہ خواتین کے نان ونفقہ کے بارے میں یہ فیصلہ کیا کہ انھیں نان ونفقہ تاحیات ملے گا اس اہم مسئلہ میں ہماری شریعت عمدہ رہنمائی کرتی ہے کہ مسلم مطلقہ خواتین کو نان ونفقہ صرف عدت کے دنوں تک رہے گا، اس کے بعد وہ شوہر کی زندگی سے بالکلیہ آزاد ہو جائیں گی، یہ اس خاتون اور سماج کے لئے بہت ہی بہتر ہوگا۔ اسلام مذہب آفاقی ہے، خدا کے قانون میں کسی بھی طرح سے کوئی عیب ونقص نہیں ہے، انصاف پر مبنی ہے اس وجہ سے عدالت کو چاہئے کہ نان ونفقہ اور اس طرح ہر وہ بات جو ہماری شریعت سے مطابقت نہ رکھتی ہو اسے فیصلہ نہیں کرنا چاہئے بلکہ جو فیصلہ ہو چکا ہے اسے واپس لے لینا چاہئے۔ کیوں کہ حقیقی طور پر ایک مسلمان کے لئے اللہ رب العزت ہی کا فیصلہ وقانون اٹل اور اصل ہے، لوک سبھا کا الیکشن گزر چکا جو ہونا تھا ہو چکا پھر بھی ملک میں نفرت کا ماحول بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جا رہی ہے۔ حالیہ دنوں میں اتر پردیش میں دکان پر ناموں کی تختی کا تغلقی فرمان جاری ہوا، یہ ہمارے ملک کے تانا بانا اور ترقی کے لئے شدید نقصان دہ ہے، میڈیا اور عوام الناس نے اس فرمان کو سرے ہی سے رد کر دیا اور جب یہ معاملہ سپریم کورٹ میں پہنچا تو کورٹ نے اس نفرتی حکم نامہ پر روک لگا دی اور پھٹکار بھی لگائی، ہمارے ملک کے دستور کے مطابق سب سے بڑی ملکی طاقت عدلیہ ہے، اس کے موقف نے ملک کے دانش مند طبقہ پر روشنی کی چھاپ چھوڑی ہے، اسی طرح عدالت کو انسانیت اور دستور ہند کا لحاظ کرتے ہوئے غیر جانبدارانہ فیصلہ کرنا چاہئے اس سے انسانیت اور ملک مضبوط ہوگا۔

شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد کے مشیر اعلیٰ ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد کے مجلس مشاورت کے اہم رکن ماہر شبلیات معروف اسکالر ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی اعزازی رفیق دار المصنفین اعظم گڑھ کو شبلیات پر گراں قدر خدمات کے اعتراف میں پہلا شبلی ایوارڈ تفویض کیا گیا، ادارہ شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کے عمر واقبال میں اضافہ فرمائے آمین۔

محمد محامد ہلال اعظمی

اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ شبلی نعمانیؒ

حیوانات پر رحم: حیوانات پر نہایت رحم فرماتے تھے، ان بے زبانوں پر جو ظلم مدت سے عرب میں چلے آتے تھے موقوف کرادیئے، اونٹ کے گلے میں قلادہ لٹکانے کا عام دستور تھا، اس کو روک دیا۔ (زندہ جانور کے بدن سے گوشت کا لوتھڑا کاٹ لیتے تھے، اور اس کو پکا کر کھاتے تھے، اس کو منع کردیا، جانور کی دم اور ایال کاٹنے سے بھی منع کیا اور فرمایا کہ ''دم ان کا مورچھل ہے اور ایال ان کا لحاف ہے'' جانوروں کو دیر تک ساز میں باندھ کر کھڑا رکھنے کی بھی ممانعت کی اور فرمایا کہ ''جانوروں کی پیٹھوں کو اپنی نشست گاہ اور کرسی نہ بناؤ'' اسی طرح جانوروں کو باہم لڑانا ناجائز بتایا، ایک بے رحمی کا دستور یہ تھا کہ کسی جانور کو باندھ کر اس کا نشانہ بناتے تھے اور مشقِ تیر اندازی کرتے تھے، اس سنگ دلی کی بھی قطعاً ممانعت کردی۔

ایک دفعہ ایک گدھا راہ میں نظر پڑا جس کا چہرہ داغا گیا تھا، فرمایا کہ ''جس نے اس کا چہرہ داغا ہے، اس پر خدا کی لعنت ہے'' علامت یا بعض دیگر ضرورتوں کی وجہ سے اونٹوں اور بکریوں کو داغنا پڑتا تھا، ایسی حالت میں آپ ﷺ ان اعضا کو داغتے جو زیادہ نازک نہیں ہوتے، حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ بکریوں کے ریوڑ میں گیا تو دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ بکریوں کے کان داغ رہے ہیں۔

(ایک بار آپ ﷺ کسی سفر میں جارہے تھے، لوگوں نے مقام پر منزل کیا، وہاں ایک پرندہ نے انڈا دیا تھا، ایک شخص نے وہ انڈا اٹھالیا، چڑیا بے قرار ہوکر پر ماررہی تھی، آنحضرت ﷺ نے دریافت کیا کہ ''اس کا انڈا چھین کر کس نے اس کو اذیت پہنچائی'' ان صاحب نے کہا یا رسول اللہؐ مجھ سے یہ حرکت ہوئی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''وہیں رکھ دو''

ایک صحابی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے، ان کے ہاتھوں میں چادر سے چھپے ہوئے کسی پرندہ کے بچے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا عرض کی کہ ''ایک جھاڑی سے آواز آرہی تھی جاکر دیکھا تو یہ بچے تھے، میں ان کو نکال لیا، پرندہ نے یعنی ان بچوں کی ماں نے یہ دیکھا تو میرے سر پر منڈلانے لگی'' آپ ﷺ نے فرمایا ''جاؤ اور بچوں کو وہیں پھر رکھ آؤ''

ایک بار راستہ میں ایک اونٹ نظر سے گذرا جس کے پیٹ اور پیٹھ شدت گرسنگی سے ایک ہوگئے تھے، فرمایا کہ ''ان بے زبانوں کے متعلق خدا سے ڈرو'' ایک دفعہ ایک انصاری کے باغ میں آپ ﷺ تشریف لے گئے، ایک گرسنہ اونٹ نظر پڑا، آپ ﷺ کو دیکھ کر بلبلایا، آپ ﷺ نے شفقت سے اس پر ہاتھ پھیرا، پھر لوگوں سے اس کے مالک کا نام پوچھا، معلوم ہوا کہ ایک انصاری کا ہے، ان سے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اس جانور کے معاملہ میں تم خدا سے نہیں ڈرتے''۔

رحمت ومحبتِ عام: (حضور انور ﷺ کی ذات پاک تمام دنیا کے لیے رحمت بن کر آئی تھی، حضرت مسیحؑ نے کہا تھا ''میں امن کا شہزادہ ہوں'' لیکن شہزادۂ امن کی اخلاقی حکومت کا ایک کارنامہ بھی اس کے ثبوت میں محفوظ نہیں لیکن امن کے شہنشاہ کو خداوند ازل ہی نے خطاب کیا: وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ. (الانبیاء۲۱:۱۰۷) محمد ﷺ! ہم نے تم کو تمام دنیا کے لیے رحمت بناکر بھیجا ہے۔ (سیرۃ النبیؐ، جلد: دوم، ص:۳۰۹-۱۱)

مولانا عمر احمد عثمانی

اصولِ درایت

اصول درایت

سب سے اہم بات جو ذہن میں رہنی چاہیے وہ یہ ہے کہ احادیث پر تنقید کے محدثین کے ہاں دو طریقے ہیں روایت اور درایت۔ روایت کے طریق سے تنقید راویوں کی ثقاہت اور ضعف کی بناء پر کی جاتی ہے۔ یعنی یہ دیکھا جاتا ہے کہ راوی کس مرتبہ کا ہے۔ وہ ثقہ ہے یا نہیں۔ اس کا حافظہ کیسا تھا۔ اس کے ہم عصروں نے اس کے متعلق کن خیالات کا اظہار کیا ہے اس کے عقائد کیسے تھے وغیرہ وغیرہ۔

درایت کی رو سے بھی احادیث پر تنقید کی جاتی ہے۔ اس کے اصول بھی ہمارے محدثین نے منضبط فرمادیئے ہیں۔ درایت کے اصول بہت ہیں لیکن ان میں موٹے موٹے اصول یہ ہیں:

(۱) جو حدیث، نص قرآنی کے خلاف ہو، وہ صحیح نہیں ہوسکتی۔

(۲) جو حدیث، کسی حدیث متواتر کے خلاف ہو، وہ صحیح نہیں ہوسکتی۔

(۳) جو حدیث، عقل سلیم کے خلاف ہو، وہ صحیح نہیں ہوسکتی۔

(۴) جو حدیث، کسی مشہور تاریخی واقعہ کے خلاف ہو، وہ صحیح نہیں ہوسکتی۔

(۵) جو حدیث، مشاہدات کے خلاف ہو، وہ صحیح نہیں ہوسکتی۔

(۶) جو حدیث، اجماع قطعی کے خلاف ہو، وہ صحیح نہیں ہوسکتی۔

(۷) جس حدیث میں معمولی نیکی پر بہت زیادہ ثواب یا معمولی گناہ پر غیر معمولی عذاب کا بیان ہو، وہ صحیح نہیں ہوسکتی۔

(۸) جس حدیث میں ترک دنیا کی تاکید کی گئی ہو کہ انسان فطرۃً اس پر عمل نہ کرسکے، وہ صحیح نہیں ہوسکتی۔

(۹) حدیث کا راوی کوئی ایسا مضمون بیان کرے جو اس عقیدہ کی تائید کرتا ہو، صحیح نہیں ہوسکتی۔

(۱۰) جس حدیث کا راوی خود اس کا اقرار کرے کہ اسی نے یہ حدیث وضع کی ہے، صحیح نہیں ہوسکتی۔

(۱۱) جو حدیث، حِسّیات کے خلاف ہو، وہ صحیح نہیں ہوسکتی۔

(۱۲) جس حدیث کے الفاظ میں رکاکت پائی جائے جو عربی قواعد سے گری ہوئی ہو، وہ صحیح نہیں ہوسکتی۔

(۱۳) جس حدیث میں معنوی رکاکت پائی جائے جو نبوت کے وقار کے خلاف ہو، وہ صحیح نہیں ہوسکتی۔

(۱۴) حدیث میں کوئی ایسا واقعہ بیان کیا گیا جو اگر واقع ہوتا تو اس کے راوی بہت لوگ ہوتے، وہ صحیح نہیں ہوسکتی۔

(۱۵) حدیث مختلف طریقوں سے مروی ہو مگر نفس مضمون میں یکسانیت نہ ہو اور معنوں میں مغائرت پائی جائے وہ صحیح نہیں ہوسکتی۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے سیرۃ النبی، مؤلفہ علامہ شبلی مقدمہ جلد اول ص ۲۶ تا ۵۰ بحوالہ ابن جوزی و ملا علی قاری، مطبوعہ، ناشران قرآن لمیٹڈ اُردو بازار لاہور)

درایت کے اصول تو بہت ہیں، میں نے موٹے موٹے اصول بیان کردیئے ہیں، ہمارے علماء میں دو گروہ پائے جاتے ہیں، محدثین اور فقہاء۔

محدثین کا کام یہ ہے کہ وہ روایت کے طریق سے احادیث کی چھان پھٹک کریں اور بتائیں کہ اسناد کے اعتبار

سے کونسی حدیثیں صحیح ہیں اور کون سی ضعیف ہیں۔ اور ان میں اضطراب یا غرابت اور شذوذ تو نہیں ہے۔ انہوں نے بہت محنت ومشقت کے بعد احادیث کے مختلف درجات مقرر کرکے ہر حدیث کے متعلق بتادیا ہے کہ وہ کس درجہ کی حدیث ہے اور اس میں کون کون سے نقص پائے جاتے ہیں۔ انسانی فروگذاشت اور سہو ونسیان سے قطع نظر انہوں نے جس عظیم الشان کام کا بیڑا اُٹھایا تھا اسے خاصی حد تک مکمل کردیا۔

فقہی احادیث کی درایت کی رو سے تنقید

درایت کی رو سے احادیث کی چھان پھٹک کا کام محدثین کا نہیں تھا بلکہ یہ کام دوسرے اکابرین امت کا تھا۔ ان میں جو احادیث فقہی مسائل سے متعلق تھیں ان کی چھان پھٹک درایت کی رو سے ہمارے فقہاء نے بڑی حد تک فرمادی۔ چنانچہ فقہی مسائل میں فقہاء کے اختلافات اسی درایت پر مبنی ہیں۔ اسناد کے لحاظ سے بے شمار حدیثیں صحیح ہیں۔ مگر اکثر فقہاء نے ان کو درایت کے اعتبار سے قبول نہیں کیا۔ فقہاء کے چار مدرسہ ہائے فکر ہی کو لے لیجئے، ان میں سے کسی مدرسۂ فکر کے متعلق یہ بھی تصوّر نہیں کیا جاسکتا کہ انہیں وہ صحیح احادیث نہ پہونچی ہوں جن سے دوسرے مکتبۂ فکر والوں نے استدلال کیا ہے، آپ فرض کرسکتے ہیں (فرض ہی کرسکتے ہیں حقیقت میں ایسا نہیں ہے) کہ کسی خاص امام تک کوئی حدیث نہ پہنچی ہو۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کے اصحاب اور متبعین تک بھی وہ حدیث نہ پہنچی ہو۔ مثلاً اگر امام ابوحنیفہؒ کو ایک صحیح حدیث نہیں پہنچی تو اس کا امکان نہیں ہے کہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمد اور امام زفرؒ تک بھی وہ حدیث نہ پہنچی ہو جب کہ یہ حضرات امام مالکؒ کے بھی شاگرد ہیں) اور امام شافعیؒ سے ان کے مناظرے ہوتے رہے ہیں۔ پھر ان روایات کو نہ ماننے کی کیا وجہ تھی؟ وجہ یہی تھی کہ ان حضرات کے نزدیک درایت کے نقطۂ نظر سے وہ احادیث صحیح نہیں تھیں اس لئے اُنہوں نے ان کو قبول نہیں فرمایا۔

فقہائے حنفیہ کے نزدیک احادیث وہی قابل قبول ہوتی ہیں جو اقرب الی القرآن ہوں اور مشہور کے درجہ میں ہوں یعنی ان کے راوی ہر طبقہ میں کم از کم تین ہوں۔ اور عام فقہاء نے ان کو قبول کرلیا ہو۔

میں اپنے ایک مقالہ ''خاتمۃ الکلام فی القراءۃ خلف الامام'' میں جو حضرت والد صاحب حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی حیات میں ان کی پسندیدگی اور ان کے تقریظی دیباچہ کے ساتھ شائع ہوچکا ہے۔ تفصیل کے ساتھ بحث کرچکا ہوں جو العزیز پبلشنگ ہاؤس ہیرآباد حیدرآباد سے شائع ہوچکا ہے۔ پوری تفصیلی بحث اس مقالہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کا مختصر اقتباس میں نے شروع میں بھی دیا ہے۔ اب تفصیل سے دے رہا ہوں، میں نے اس کی تمہید میں لکھا تھا کہ

اس نجی گفتگو میں جو مسائل زیر بحث آئے تھے وہ صرف تین مسئلے تھے، فاتحہ خلف الامام، آمین بالجہر اور رفع یدین اتفاق سے یہ تینوں مسئلے جماعت اہل حدیث سے مخصوص نہیں ہیں، بلکہ ائمہ اربعہ کے درمیان پہلے سے مختلف فیہ چلے آرہے ہیں، لہٰذا ان کے متعلق ہمارا یہ عقیدہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ باطل اور غلط ہیں۔ کیوں کہ ہم فقہ کے مسالک اربعہ کو تسلیم کرتے ہیں اور کسی ایسے مسئلہ کی تغلیط کرہی نہیں سکتے جس کا کوئی ایک فقہی مسلک بھی قائل رہا ہو۔ لہٰذا ان تینوں مسائل کے متعلق ہمارا مسلک صرف یہ ہے کہ ہمارے

نزدیک ان میں حنفی مسلک راجح ہے۔ اور دوسرے مسالک مرجوح ہیں۔

ہمارا ظن غالب یہی ہے کہ حنفی مسلک صحیح ہے لیکن دیگر ائمہ کے مسائل کو بھی ہم غلط نہیں کہتے، ہم اس امکان کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ حنفی مسلک غلط ہو اور دیگر ائمہ کا مسلک صحیح ہو۔ لہٰذا اس قسم کے مسائل میں نہ حنفیہ کے ہاں تشدد برتا جاتا ہے۔ اور نہ برتا جاسکتا ہے۔ البتہ اگر کوئی مسئلہ ایسا ہو جس میں ہر چہار ائمہ ایک جانب ہوں اور علماء اہل حدیث ان سب کے خلاف دوسری طرف ہوں تو ایسے مسئلہ میں شاید علمائے اہل حدیث کی تغلیط کی جاسکے۔ لیکن مضمون زیر بحث میں تو کوئی ایسا مسئلہ تھا ہی نہیں، لہٰذا سمجھ میں نہیں آتا کہ مدیر الاعتصام قبلہ والد صاحب کے اس مضمون پر اس قدر چراغ پا کیوں ہوگئے۔

انہوں نے نہایت متانت اور سنجیدگی کے ساتھ اس حقیقت کو پیش فرمایا تھا کہ فقہائے حنفیہ کا اصول یہ ہے کہ وہ پہلے قرآن کو دیکھتے ہیں۔ پھر احادیث کو اور جس حدیث کو نص قرآن کے موافق پاتے ہیں اس کو ترجیح دیتے ہیں اور دوسری احادیث کو محامل حسنہ پر محمول کرتے ہیں۔

اب میں تم کو بتلاتا ہوں کہ جن مسائل مشہورہ ہمارا اور اہل حدیث کا اختلاف ہے ان کے لئے ہم نے اول قرآن کو دیکھا اور جن احادیث کو نصوص قرآنیہ کے موافق پایا ان کو ترجیح دی۔ اگر نظر انصاف سے دیکھا جائے تو فقہائے حنفیہ کا یہ اصول قانونی اور منطقی اعتبار سے بالکل صحیح ہے۔ الخ

(ماخوذ از فقہ القرآن ص: ۹۱-۹۶)

☆☆☆

پروفیسر مظفر شمیری
سابق وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالحق یونیورسٹی کرنول، آندھرا پردیش

منقبتِ حضرتِ امام حسینؓ

کیسا وضو تھا، کیسا وہ سجدہ حسینؓ کا
اپنے لہو سے تر تھا مُصلّی حسینؓ کا

رخسار وچشم ولب پہ فدا ہوگیا لہو
اس درجہ دلفریب تھا چہرہ حسینؓ کا

کیسا ہی معرکہ ہو میں پیچھے نہیں ہٹا
دل میں اُتر گیا تھا یوں اُسوہ حسینؓ کا

ٹھوکر میں تاج وتخت، ہتھیلی پہ سر رہے
اپنا ہے زادِ راہ یہ نسخہ حسینؓ کا

اُن سے ہوا شروع، اُنہی پہ ہوا ہے ختم
اپنی مثال آپ ہے تقوا حسینؓ کا

دن میں ہے رشکِ مہر تو شب کو ہے رشکِ ماہ
پھیلا ہوا ہے دل میں اُجالا حسینؓ کا

سینے میں کربلا ہے مظفرؔ نظر میں ہے عشق
دل نے علَم اُٹھایا ہے آقا حسینؓ کا

مولانا حبیب اعظمی - استاذ جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور، اعظم گڑھ

ہجرت کی انقلابی داستان اور سن ہجری کا پس منظر

اسلامی تاریخ کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہجری سن کا باقاعدہ آغاز خلافت فاروقی میں صحابہ کرام کے مشورے سے ہوا؛ جب کہ دستاویزات اور خطوط پر تاریخ لکھنے کی ضرورت پیش آئی اور یہ بات زیر غور آئی کہ یہ کیسے معلوم ہوگا کہ یہ دستاویز یا خط کس سال کا ہے؟

دوسری قوموں کے یہاں رائج سنوں کے پس منظر کو دیکھتے ہوئے وہ اسلام کے لیے ناقابل قبول تھے۔ جب اسلام کی مستقل تہذیب اور اپنا کلچر و تمدن ہے تو پھر کسی اور کے کیلنڈر اور سن و تاریخ کو اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ مجلس مشاورت میں موجود بعض صحابہ نے ولادت نبوی، بعثت نبوی اور وفات نبوی سے سن کے آغاز کی رائیں دیں؛ مگر حضرت عمر فاروق کو ان پر شرحِ صدر نہیں ہوا۔ اولا ولادت نبوی کی تاریخ غیر متعین ہے، بعثت کے وقت ہم لوگ داخل ایمان نہیں تھے اور وفات نبوی امت کے لیے سب سے الم ناک حادثہ ہے؛ لہٰذا یہ تینوں رائیں باعمل نہ ہوسکیں۔

چناں چہ مزید غور و فکر کے بعد ہجرت نبوی کو اسلامی سن کے لیے متعین کر دیا گیا؛ کیوں کہ ہجرت تاریخ اسلام کا سب سے انقلابی اقدام تھا، جس کے بعد مکی دور کی مظلومیت کا خاتمہ ہوا اور اہل ایمان نے 'یثرب' کی آزاد فضاؤں میں سانس لی۔

یثرب کو 'مدینۃ النبی' قرار دیا گیا اور اسلام کی شان و شوکت کے نئے باب کا آغاز ہوا۔ مسلمانوں نے دین کی دعوت اور دین پر عمل کی آزادانہ جد و جہد شروع کی۔ مسجد قبا کے بعد مدینہ آکر مسجد نبوی کی تعمیر ہوئی۔ قرآن کریم کے پڑھنے پڑھانے کے حلقے لگنے لگے۔ دین کو گھر گھر سیکھا اور سمجھا جانے لگا۔ مدینہ کے گلی کوچوں میں اسلامی شان و شوکت کے نظارے نظر آنے لگے۔

بدر و احد اور خندق و حنین کے معرکوں میں حق اور اہل حق کی فتح ہوئی، صلح حدیبیہ کے بعد شاہان عجم کو دعوتِ دین کے خطوط روانہ کیے گئے۔ پھر ایک وقت وہ آیا کہ کل جس مکہ سے بے سر و سامانی کے عالم میں روپوش ہو کر نکلے تھے؛ آج اسی مکہ میں فاتحانہ داخل ہو رہے ہیں اور اور مکی زندگی کی بے پناہ مظلومیت کے باوجود زبان رسالت پر "لا تثریب علیکم" کا نعرہ ہے۔ "آج تم پر کوئی مواخذہ نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو، تم سب کے لیے معافی کا اعلان عام ہے"۔

ہجرت کی انقلابی داستان میں بے شمار درس عبرت ہیں۔ ایک مظلوم قوم فاتح بن جاتی ہے۔ مہاجرین و انصار کے درمیان اخوت قائم ہو جاتی ہے۔ ایک نئی اسلامی ریاست و حکومت کا نقشہ دنیا کے سامنے آتا ہے۔ عدل و انصاف کے مناظر دکھائی دیتے ہیں، توحید و سنت کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ ظلم و ستم کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اقتصادیات اور معیشت کو استحکام نصیب ہوتا ہے۔ اتحاد و اتفاق کا ایک ایسا نمونہ دنیا کے سامنے ہوتا ہے، جس پر آج بھی قوموں کی عروج و ترقی منحصر ہے۔

امداد الحق بختیار۔صدر شعبۂ عربی ادب جامعہ اسلامیہ دارالعلوم حیدر آباد

اسلام میں مطلقہ خواتین کا نان ونفقہ اور سپریم کورٹ کا حالیہ فیصلہ

اسلام نے ترغیب دی ہے کہ حتی الامکان نکاح کے رشتہ کو پوری زندگی برقرار رکھا جائے، شدید ضرورت اور مجبوری کے بغیر اسے ختم نہ کیا جائے؛ اسی لیے اس رشتہ کو ختم کرنے کا جو عمل ہے، جسے ''طلاق'' کہا جاتا ہے، اسلام نے شدید انسانی ضرورت کی بنیاد پر اس کی مشروط اجازت تو دی ہے؛ لیکن اجازت کے باوجود اسے سخت ناپسند قرار دیا ہے۔

تاہم بسا اوقات بعض لوگوں کے مخصوص حالات کی وجہ سے نکاح کے رشتہ کو باقی رکھنا، ان کے لیے مزید پریشانی کا سبب ہوتا ہے، اِس رشتہ میں رہنے کی وجہ سے یا تو بیوی پر ظلم ہوتا ہے، یا شوہر مظلوم بنتا ہے، یا دونوں کی زندگی عذاب بن جاتی ہے؛ لہذا اس طرح کی پریشان کن صورت حال کو ختم کرنے کے لیے ہی اسلام نے طلاق کا تصور اور نظام پیش کیا ہے؛ جس کی وجہ سے بہت سی صورتوں میں طلاق کا یہ راستہ خود عورت کے لیے رحمت ثابت ہوتا ہے۔ جن مذاہب، اقوام یا قوانین میں طلاق کا تصور نہیں پایا جاتا، وہاں اِس طرح کی صورت حال میں عورت گھٹ گھٹ کر زندگی گزارنے یا بعض اوقات خودکشی کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ لیکن اب سوال یہ کھڑا ہوتا ہے کہ طلاق کے بعد زوجین کے درمیان کوئی رشتہ باقی رہا یا نہیں؟ طلاق کے بعد بھی اُن دونوں پر ایک دوسرے کے حقوق ہوتے ہیں یا نہیں؟ کیا طلاق، علیحدگی، دونوں کا راستہ اور زندگی الگ ہونے کے بعد بھی شوہر پر مطلقہ بیوی کے نان ونفقہ کی ذمہ داری عائد ہونی چاہیے یا نہیں؟

مطلقہ کے نان ونفقہ سے متعلق سپریم کورٹ کا حالیہ فیصلہ

10 / جولائی بروز بدھ کو سپریم کورٹ کی دو رکنی بنچ نے تلنگانہ کے ایک شخص عبد الصمد کی عرضی پر سماعت کرتے ہوئے فیصلہ دیا کہ ضابطہ فوجداری (سی آر پی سی) کے سیکشن 125 کے تحت ایک مسلم خاتون اپنے شوہر سے نان ونفقہ حاصل کرسکتی ہے، یہ قانون بلا لحاظ مذہب لاگو ہوگا۔ دونوں فاضل ججس نے کہا کہ پروٹیکشن آف رائٹس آن ڈائیورس ایکٹ بابتہ 1986 مسلم خواتین پر لاگو نہیں ہوگا؛ کیوں کہ یہ سیکولر قانون کو زیر نہیں کرسکتا۔ فیصلہ میں یہ بھی کہا گیا کہ نان ونفقہ خیرات نہیں؛ بلکہ تمام شادی شدہ خواتین کا حق ہے۔

فاضل ججس کے فیصلہ کا مطلب یہ ہے کہ مسلم خواتین اپنے شوہر سے طلاق کے بعد بھی تاحیات یا تا ازدواج ثانی نان ونفقہ حاصل کرنے کا قانونی حق رکھتی ہیں۔

مطلقہ کا نان ونفقہ اور 1986 ایکٹ

سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ خود ہندوستانی قانون سے

متصادم ہوتا ہے اور دستور کے مخالف جاتا ہے؛ کیوں کہ ہندوستانی آئین کا آرٹیکل 25 ہندوستان میں رہنے والے تمام طبقوں کو مذہبی آزادی کی ضمانت دیتا ہے۔ نیز 1937 کے شریعت اپلیکیشن ایکٹ نے مسلمانوں کو شادی، طلاق، وراثت اور دیگر عائلی معاملات میں اپنے مذہبی قوانین کے مطابق عمل کرنے کی آزادی دی۔ اسی طرح جب 1985 میں شاہ بانو کیس میں عدالت نے دفعہ 125 کے تحت ہی فیصلہ سناتے ہوئے، عدت کے بعد بھی مطلقہ کو نان ونفقہ دینے کا اسی طرح کا فیصلہ سنایا تھا، تو مسلمانوں نے اس کے خلاف ملک میں جمہوری طور پر زبردست تحریک چلائی تھی، جس کے دباؤ میں اس وقت کی انڈین حکومت نے پارلیمنٹ سے 1986 کا ایکٹ پاس کیا۔ اس قانون کے مطابق جب کوئی مطلقہ مسلمان خاتون عدت کے بعد اپنے اخراجات برداشت نہیں کرسکتی، تو عدالت مطلقہ خاتون کے رشتہ داروں کو اسے نفقہ دینے کا حکم دے گی، جو اسلامی قانون کے مطابق اس کے اثاثوں کے جانشین ہیں۔ لیکن اگر ایسے رشتہ دار نہیں ہیں، یا وہ اخراجات برداشت نہیں کرسکتے، تو اس صورت میں عدالت ریاستی وقف بورڈ کو نفقہ دینے کا حکم دے گی۔ یوں طلاق دینے کے بعد شوہر کے ذمہ محض عدت کے دوران کے اخراجات ہی باقی رہتے ہیں۔

لہٰذا عبدالصمد کے معاملہ میں سپریم کورٹ کا حالیہ فیصلہ دستور کی دفعہ 25، مسلم پرسنل لاز جیسے شریعت اپلیکیشن ایکٹ 1937 اور مسلم خواتین (طلاق پر حقوق کا تحفظ) ایکٹ، 1986 کے خلاف ہے۔ اور جب تک یہ دونوں قانون دستور اور قانون کا حصہ ہیں، کسی جج کو اس طرح کا فیصلہ سنانے کا دستوری حق نہیں ہے۔

اسی کے ساتھ سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ معاشرہ کے بھی خلاف ہے، عقل کے بھی خلاف ہے اور ہندوستان میں رہنے والی دوسری سب سے بڑی کمیونٹی (Second largest Indian Community) کے مذہب اور عقیدہ کے بھی خلاف ہے۔

فیصلہ عقل کی میزان میں

اسلام کے ساتھ تمام ملکی قوانین میں ازدواجی رشتہ ایک معاہدہ ہے، اس رشتہ کو وجود میں لانے کا بھی ایک طریقہ ہے اور ختم کرنے کا بھی ایک طریقہ ہے، یہ کوئی خونی رشتہ نہیں ہے، جو پیدائش سے موت تک برقرار رہے، اس مخصوص معاہدہ سے پہلے بھی زوجین کا آپس میں کوئی رشتہ ہونا ضروری نہیں اور اس معاہدہ کے ختم ہونے کے بعد بھی، معاہدہ سے متعلق کوئی رشتہ باقی نہیں رہتا۔

جب یہ ایک معاہدہ ہے، اس معاہدہ کے بعد ہی شوہر پر بیوی کی ذمہ داری آتی ہے، اس سے پہلے یہ ذمہ داری اس پر نہیں ہوتی، تو جب یہ معاہدہ کسی وجہ سے ختم ہوجاتا ہے، تو پھر شوہر پر بیوی کے نان ونفقہ کی ذمہ داری کیوں باقی رہے گی؟

نیز شوہر پر بحیثیت بیٹا اپنے والدین کی ذمہ داری ہوتی ہے، بحیثیت باپ اپنے بچوں کی ذمہ داری ہوتی ہے، بحیثیت بھائی اپنے بھائی بہنوں کی ذمہ داری ہوتی ہے، جبکہ دوسری طرف بیوی پر سوائے اپنی ذات کے کسی دوسرے کی ذمہ داری اس پر نہیں ہوتی؛ بلکہ اس کی ذمہ داری بھی اس کے والدین وغیرہ پر ہوتی ہے۔ لہٰذا طلاق اور عدت کے بعد بھی شوہر پر تاحیات مطلقہ کی کفالت کو لازم قرار دینا غیر سماجی اور عقل میں نہ آنے والا (Non-Rational) فیصلہ ہے۔

خواتین کے حق میں نقصان دہ فیصلہ

اگر گہرائی سے اس فیصلہ پر غور وخوض کیا جائے، تو یہ فیصلہ غیر واجبی ذمہ داری ڈال کر نہ صرف شوہر پر زیادتی کر رہا ہے؛ بلکہ یہ خواتین کے حق میں بھی مفید نہیں ہے؛ ان کے لیے نقصان دہ اور بڑی مصیبت کا دروازہ کھولتا ہے؛ کیوں کہ جب شوہر کو معلوم ہوگا کہ طلاق کے بعد بھی پوری زندگی اسے اپنی مطلقہ بیوی کی ذمہ داری اٹھانی ہے، تو وہ طلاق دینے پر اقدام نہیں کرے گا؛ چاہے عورت کو ہی طلاق کی ضرورت کیوں نہ ہو؛ بلکہ نکاح میں باقی رکھتے ہوئے، اس کے ساتھ اجنبیوں والا سلوک کرے گا، یا اس سے چھٹکارے کی دیگر غیر قانونی راہ اختیار کرے گا۔ جس میں ظاہر ہے کہ عورت کا ہی نقصان ہے۔

غیر سماجی (Anty Society) فیصلہ

اگر اس طرح کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے مردوں کی طرح خواتین کو بھی طلاق لینے اور دینے کے اختیار کا قانون بنایا جائے، جیسا کہ یورپین ممالک میں اس کا عام رواج ہے، تو ان یورپین ممالک کی طرح یہاں بھی اس سے معاشرہ میں نکاح کی شرح میں کمی آئے گی۔ اس ڈر سے کہ نکاح اور طلاق کے بعد شوہر کی جائیداد کا ایک بڑا حصہ عورت لے کر چلی جائے گی، مرد حضرات نکاح کے بجائے بغیر نکاح کے خواتین سے تعلق قائم کرنے کو ترجیح دیں گے، جیسا کہ یورپین ممالک میں یہ بھی عام ہے۔ اور اگر ایسا ہوا تو یہ فیصلہ معاشرہ کے لیے انتہائی نقصان دہ ثابت ہوگا، اس کی وجہ سے معاشرہ بے حیائی کے دلدل میں ڈوب جائے گا، انسانی اقدار کی کھلے عام پامالی ہوگی، خود غرضی اور مفاد پرستی بڑھ جائے گی، صرف ایک دوسرے کو استعمال کر کے چھوڑ دینے کا سلسلہ بڑھ جائے گا۔ اس سے عورتوں کے استحصال کی شرح مزید بڑھے گی۔

ظاہر ہے کہ اس میں بھی خواتین کا ہی نقصان ہے، ایسی صورت حال میں زندگی کے اُس مرحلہ میں اُس کا کوئی سہارا نہ ہوگا، جب کہ وہ قدرت کی عطا کی ہوئی خوبصورتی اور جسمانی طاقت دونوں سے محروم ہوچکی ہوگی۔ وہ اس وقت تنِ تنہا، بے یار و مددگار ہوگی اور دَر، دَر کی ٹھوکرے کھانے پر مجبور ہوگی۔

غلط استعمال کے دروازے کھولنے والا فیصلہ

بعض بد اخلاق عورتیں اس قانون سے ہمت پا کر شادی کے بعد زبردستی شوہر سے طلاق لیں گی، تا کہ وہ آزادنہ زندگی گزاریں اور خرچہ کا پورا بوجھ شوہر پر ڈالیں۔ بعض عورتیں سابق شوہر سے انتقام لینے اور پوری زندگی نفقہ حاصل کرنے کے لیے جان بوجھ کر دوسرا نکاح بھی نہیں کریں گی۔ اور غیر اخلاقی راستے اختیار کریں گی۔

اسلام میں مطلقہ کا نفقہ

اسلام میں ضابطہ یہ ہے کہ جب تک بیوی شوہر کی زوجیت میں رہتی ہے، اس وقت تک اس کا نان ونفقہ شوہر کے ذمہ ہوتا ہے؛ اسی طرح طلاق کے بعد بھی عدت گزرنے کی مدت تک رہائش اور نان ونفقہ کی ذمہ داری شوہر پر ہی ہوتی ہے۔ جس کی مکمل تفصیل سورہ طلاق، پارہ 28 میں موجود ہے۔ البتہ عدت گزرنے کے بعد چوں کہ دونوں کے درمیان رشتہ ازدواج بالکل ختم ہوجاتا ہے؛ اب دونوں کے درمیان سے نکاح سے متعلق کسی طرح کا کوئی

رشتہ باقی نہیں رہتا؛ لہٰذا اس کے بعد سے مطلقہ بیوی کا نفقہ شوہر کے ذمہ نہیں ہے۔

کیا اسلام نے مطلقہ جیسی خواتین کو بے سہارا چھوڑا ہے؟

سوال یہ ہوتا ہے کہ جب مطلقہ کا نان ونفقہ سابقہ شوہر کے ذمہ نہیں ہوگا، تو اس کی کفالت کون کرے گا، کون اس کے نان ونفقہ کی ذمہ داری برداشت کرے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام نے مطلقہ اور بیوہ جیسی خواتین کو بے سہارا نہیں چھوڑا، اسلام میں شادی کے بعد بھی خاتون کا رشتہ اپنے میکے والوں سے بدستور قائم رہتا ہے، چنانچہ طلاق کے بعد اس کے والدین، اس کے بھائی بہنوں اور اس کی اولاد پر اس کی کفالت کی ذمہ داری ہوتی ہے، جس کا ضابطہ یہ ہے کہ اس کے مرنے کے بعد جتنے لوگ اس کی چھوڑی ہوئی جائیداد اور مال کے وارث ہوتے ہیں، زندگی میں بھی وہی لوگ اس کے کفیل اور نان ونفقہ کے ذمہ دار ہوں گے۔

نیز اگر اس کی اولاد نابالغ ہے، تو 8 سال تک لڑکے اور بالغ ہونے تک لڑکی کی پرورش شوہر کے بجائے بیوی کے پاس ہوگی۔ اور اولاد اور پرورش کرنے والی بیوی، ان سب کا مکمل معقول خرچہ شوہر کے ذمہ ہوگا۔ اتنی مدت تک اس طرح بھی اس کا نان ونفقہ چل سکتا ہے۔

اسی طرح اسلام میں خاتون کو والدین کی میراث میں بھی حصہ ملتا ہے، نیز بھائی بہنوں کی میراث سے بھی بعض صورتوں میں حصہ ملتا ہے۔ اس سے بھی گزر اوقات ہوسکتی ہے۔ اور اگر خدانخواستہ ان میں سے کوئی صورت نہ ہو؛ حالانکہ ایسا ہونا بہت شاذ ونادر (Rare) ہے، تو ایسی صورت حال میں افراد خاندان اور مسلم معاشرہ کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اس طرح کی خواتین کی کفالت کریں اور ان کا تعاون کریں۔

چوں کہ یہ تمام تصور برادران وطن کے یہاں نہیں پایا جاتا؛ وہ نکاح کو تا زندگی اٹوٹ رہنے والا رشتہ تصور کرتے ہیں، ان کے یہاں پہلے طلاق کا تصور ہی نہیں تھا، میراث کا نظام نہیں تھا؛ حتی کہ شادی کے بعد میکے سے لڑکی تعلق ختم سمجھا جاتا تھا، جس کے اثرات سے ابھی بھی ان کا معاشرہ پورے طور نہیں نکل سکا ہے؛ اسی لیے وہ سابقہ شوہر پر ہی نفقہ کی ذمہ داری ڈالنے کی بات کرتے ہیں۔

بے سہارا خواتین کے حوالے سے شعور بیداری کی ضرورت

ہر مشکل سے نمٹنے کے لیے اسلام نے کوئی نہ کوئی راستہ ضرور بتایا ہے، ہر مشکل گھڑی میں اسلام نے اپنے ماننے والوں کی دست گیری لازمی کی ہے، پریشانی میں کھڑا کر کے ان کو بے یار ومددگار نہیں چھوڑا ہے؛ لیکن پریشانی اس وقت کھڑی ہوتی ہے، جب ہم اسلام کی بتائی ہوئی راہ کو اختیار نہیں کرتے؛ چنانچہ مطلقہ اور بیوہ جیسی خواتین کے مسائل سامنے آنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم نے ان کے حوالے سے اپنے دین کی بتائی ہوئی ہدایات (Instructions) پر عمل نہیں کیا، جس کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ برادران وطن کی طرح ہمارے مسلم معاشرہ میں بھی بیوہ اور مطلقہ خواتین سے نکاح کو معیوب سمجھا جانے لگا، استطاعت کے باوجود نکاح ثانی کو جرم اور گناہ سمجھا جانے لگا؛ جس کی وجہ سے یہ مسائل کھڑے ہوئے۔ جب کہ مطلقہ اور بیوہ سے نکاح خود ہمارے نبی ﷺ کی سنت ہے؛ چنانچہ سوائے سیدہ عائشہؓ کے رسول اللہ ﷺ کی تمام ازوج مطہرات یا تو مطلقہ تھیں یا بیوہ تھیں۔ اس حوالے سے قرآن کی صریح ہدایت پر ہم عمل پیرا نہیں ہیں، اللہ تعالی کا ارشاد

ہے: وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ. ترجمہ:اورتم نکاح کراؤ اپنے (معاشرہ) میں سے بے نکاحے (مردوں اورخواتین) کا۔(سورۃالنور.32)

اسی طرح ہمارے اندر ایک دوسرے کے تعاون کا جذبہ اتنا کم ہوگیا ہے کہ ہم اپنی فیملی کے علاوہ کسی اور کی ذمہ داری اپنے اوپر نہیں سمجھتے؛حتی کہ بہت سے بدنصیبوں کو اپنے والدین کی ذمہ داری بھی بوجھ لگنے لگی ہے، جو اسلامی تعلیمات(Teachings) کے بالکل خلاف ہےاوراسی وجہ سے غیرشرعی عدالتیں ہماری شریعت میں دخل اندازی کر رہی ہیں۔

مسلمان اپنے معاملات کے لیےدارالقضاء سے رجوع ہوں

جن ممالک میں مسلمانوں کی حکومت نہیں ہے، ملکی عدالتیں مسلمانوں کے معاملات میں کتاب وسنت کے بجائے اپنے ملکی قوانین کے مطابق فیصلے صادر کرتی ہیں، ایسے تمام خطوں میں بسنے والے مسلمانوں کے لیےضروری ہے کہ وہ اپنے مسائل؛خصوصاً عائلی مسائل کے لیے کورٹ، کچہری اور پولیس اسٹیشن کے بجائے دار القضاء کا رخ کریں، تاکہ کتاب وسنت کی روشنی میں ان کے مسائل کا جائز،صحیح اورحق پرمبنی تصفیہ ہوسکے۔ یادرکھنا چاہیے دنیاوی عدالتوں سے اگرکسی نے کوئی ایسا فیصلہ اپنے حق میں کرالیا، جوقرآن وحدیث کے خلاف ہے،تواس فیصلہ کی بنیاد پراس کے لیے دوسرے کامال لینا جائز نہ ہوگا،شریعت کی نگاہ میں وہ ناجائز اورحرام مال ہوگا۔ ہمارے مرد اورخواتین سب کو یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے۔

☆☆☆

فراز ادیبی۔مبارکپور،اعظم گڑھ

غزل

ہوئی طوفاں کی مجھ پر اِس طرح یلغار پانی میں
مرے ہاتھوں سے چھٹ کرگرپڑی تلوار پانی میں

مری کشتی بھنور کی قید سے جب تک نہ نکلے گی
رہوں گا موج سے میں برسرِ پیکار پانی میں

ترے دستِ ہنر کو میں کرشمہ ساز سمجھوں گا
بنالے تو اگر اِک ریت کی دیوار پانی میں

اُچھل کرموج لیتی ہے یہ کس کے پاؤں کا بوسہ؟
کھڑا ہے کون؟ پیاسوں کا عَلَم بردار پانی میں

پڑی ضربِ عصائے موسوی جس وقت دریا پر
اُسی دم ہوگیا اِک راستہ ہموار پانی میں

ردائے بنتِ حوّا پر پڑے جب طنز کے چھینٹے
مرے سر سے اُچھل کرگر پڑے دستار پانی میں

اگر غیرت کا پانی آنکھ میں محفوظ تم رکھتے
نہ یوں بہتا تمہارے حُسن کا معیار پانی میں

کسی دن اے فرازؔ! اپنی بھی اُس میں باریابی ہو
لگا رکھا ہے جَل پریوں نے جو دربار پانی میں

عمارہ فردوس۔ جالنہ،مہاراشٹر

اٹھ! کہ پھر قائم کریں میزان عدل۔۔

خلافت راشدہ کا سنہرا دور ہونٹوں پر مسکراہٹ کے پھول کھلاتا ہے، وہیں اس کا زوال آنکھوں سے ندامت کے آنسو جاری کردیتا ہے، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انتھک کوششوں سے جس جماعت کی تشکیل فرمائی تھی وہ ایک طرف دنیا سے بے نیاز تھی تو دوسری طرف دنیا پر حکمرانی کرنے والی تھی، ایک طرف خدا پرستی میں بے مثال تھی، تو دوسری طرف امور جہاں بانی میں یکتائے زمانہ تھی۔۔۔ ایسے پاکیزہ نفوس اس دنیا کے امام بنائے گیے تھے جنکی عظمت وتابانی کے نقش تا قیامت زمین پر ثبت رہیں گے، جنھوں نے قیصر وکسریٰ کے تخت الٹ کر اپنی عظمت کا سکہ جمایا تھا، جن کے دبدبے سے پہاڑ ہیبت سے رائی کی طرح ریزہ ریزہ ہوجاتے تھے۔۔ جو راتوں کے عابد تھے تو دن کے مجاھد تھے، جو علم وحکمت کے دریچے کھولنے والے تھے، جو نفوس قدسیہ صبغت اللہ کے ایک رنگ میں رنگے ہوئے تھے مسجد سے لیکر بازار تک، مدرسہ سے لیکر عدالت تک اور گھروں سے لیکر میدان کارزار تک خدا کے بندے بنائے گیے تھے۔ ان کے پاس جن صداقتوں کی تعلیم مسجد کے منبروں پر سے دی جاتی تھی انھیں صداقتوں پر حکومت کا نظم ونسق بھی چلتا تھا۔۔

جس سنہرے دور کا یہ باب تھا دنیا اسے خلافت علی منہاج النبوۃ کے نام سے یاد کرتی ہے۔۔۔۔۔ پھر رفتہ رفتہ ہم نے اپنی عظمت کو کھونا شروع کیا، تقدیر امم کے اس باب میں جھول پڑنے لگا۔۔ جبر کی ارزانیاں اور ظلم کی بہتات نے آخر کار خلافت کی قبا چاک کردی۔۔۔

مسلمانوں کے ہاتھ مسلمانوں کے خون سے رنگین ہوئے، وقت نے کروٹ بدلی اور یہ خوبصورت رنگ بکھرتے چلے گیے، قدریں بدل گئیں، جہاں تقوی کے جام لنڈھائے جاتے تھے وہاں اب سامان تعیش کے مزے لیے جارہے تھے، جہاں رائی برابر ناانصافی کی گنجائش نہیں تھی، اب وہاں انصاف کی راہوں سے خود خلیفۃ المسلمین کترا کر نکل جاتے، جہاں قرآن کا دستور نافذ تھا وہاں اب اپنے من پسند قوانین وضع کیے جارہے تھے۔

ان الحکم الا للہ کا تصور ختم کرنے کی کوشش غیر محسوس طریقہ سے اپنی جگہ بنا رہی تھی اور پھر رفتہ رفتہ امت مسلمہ اپنی عظمت رفتہ کو کھو کر ایک بڑے زوال کی جانب گامزن ہوگئی۔۔ خلافت کا پیرہن تار تار ہوا۔۔ قدریں بدلیں تو تعبیریں بدل گئیں، میزان بدلے تو دستور بدل گیے، راہیں تبدیل ہوئیں تو تصورات کی دنیا بدل گئی، رویوں میں فرق آیا تو دلوں کی دنیا مکدر ہوگئی، خدا خوفی کو کنارے کیا گیا تو ایک روشن دور کنارے ہوگیا، اور پھر روشن تاریخ نے اپنے جسم پر پہنے روشن لباس کو نکال پھینکا۔ پھر تاریخ نے دیکھا کہ خلافتِ راشدہ کو بچانے کے لیے نواسہ رسول کے سرتن سے

جدا ہو گیے۔ خدا کے دین کے سچے شیدائی آج بھی اس روشن دور کو واپس لانے کے لیے اپنی آنکھوں میں خواب سجاتے ہیں،۔۔

جو دور خدائی اصولوں سے مزین تھا۔ جہاں ایک عورت صنعا سے لیکر حضرموت تک اکیلے سونا اچھالتے ہوئے سفر کرتی تو محفوظ رہتی۔۔۔۔۔

۔۔۔خلافت وہ ہوتی ہے جہاں ایک گورنر کے بیٹے کو قبطی غلام پر ایک کوڑا برسانے کی سزا بھری مجلس میں یہ کہہ کر دی گئی "متی تعبدتم الناس وقد ولدتهم امهاتهم احرارا" تم نے لوگوں کو کیسے غلام بنالیا جبکہ ان کی ماؤں نے انھیں آزاد پیدا کیا ہے۔

۔۔۔خلافت وہ ہوتی ہے جہاں بیت المال کو امانت تصور کیا جاتا ہو جہاں ایک عام آدمی بھی خلیفہ سے جواب طلب کرسکتا ہو، کہ اے امیر المؤمنین! یمن سے جو مال آیا تو اس کپڑے میں اتنا طول وعرض تو نہیں تھا کہ کرتا سلایا جاسکے، تب آپ کے جسم پر یہ لمبا کرتا کیسے بن گیا۔؟

۔۔۔خلافت وہ ہوتی ہے جہاں خلیفہ سے ہر کوئی مل کر اپنے مسائل شئیر کرسکے، اظہار رائے کی مکمل آزادی ہر فرد کو حاصل ہو۔

۔۔۔۔خلافت وہ ہوتی ہے جہاں وقت کا امیر المومنین راتوں کو خدا خوفی سے گشت کرتا پھرتا ہے کہ کہیں کوئی ایک شخص بھی بھوکا سوجائے تو رب کی بارگاہ میں خلیفہ جوابدہ ہوگا۔

۔۔۔۔خلافت وہ ہوتی ہے جہاں (Adviser council) شورائیت کے ذریعہ تقوی اور خدا خوفی کی بنیاد پر رائے دہی کی جائے۔

۔۔۔خلافت وہ ہوتی ہے جہاں خدائی احکام کی مکمل پابندی ہو اور سزائیں و حدود کا نفاذ ایسا ہو کہ اعلان کردیا جائے "خدا کی قسم محمد کی بیٹی فاطمہؓ اور پھوپی صفیہؓ بھی اگر چوری کرتی تو اسکے ہاتھ کاٹ دیے جائیں"۔۔۔ان سنہرے اصولوں پر خلافت کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔

۔۔۔لیکن!!

جب قدریں بدل جاتی ہیں، خدائی احکام ٹوٹنے لگتے ہیں، میزان عدل کے پلڑے ہلکے ہوجاتے ہیں، انصاف بکنے لگتا ہو، بیت المال امراء کی ملکیت بن جاتا ہو۔

۔۔۔۔جہاں شورائیت ختم کر کے جبری بیعت کی جائے اور امام مالکؒ کو بیعت پر مجبور کرتے ہوئے کوڑے برسائے جائیں اور ہاتھ اکھاڑ دیے جائیں۔

۔۔۔۔جہاں شہزادے، سپہ سالار اور خوشامدی لوگ شوریٰ کے ممبر بن جائیں، عام فرد سے اظہار رائے کی آزادی چھین لی جائے، الغرض ارکان شوریٰ کی کسوٹی تبدیل ہوجائے۔

۔۔۔جہاں خلیفہ شاہانہ ٹھاٹ کے ساتھ راستوں سے چلنے لگیں اور عام شہری سے ملاقات کرنے سے کترائے۔

۔۔۔۔جہاں بیت المال سے امانت کا تصور ختم ہو جائے اور وہ خلیفہ کی ملکیت بن جائے۔۔۔۔جہاں خلیفہ سے کسی سوال کے طلب کرنے پر سخت پابندیاں عائد کردی جائے، جہاں ابوذر غفاریؓ جیسے حق پرستوں کے لیے زمین تنگ ہوجائے۔۔۔

ان بدلی ہوئی قدروں کے ساتھ خلافت کی قبا چاک ہوگئی، خلافت کی بنیادیں ہلنے لگیں، جسے بچانے کے لیے میدان کربلا خون سے رنگین ہوا، حق پرستوں نے قرآنی

دستور کو بچانے کے لیے نیزوں پر اپنے سر گاڑھ دیے۔اپنے معصوموں کو شہید ہوتے دیکھا۔دو فوجوں کے درمیان یہ دشمنی محض الحب للہ و البغض للہ کی خاطر تھی، یہ شہادت علی الناس کا وہ منصب تھا جس کے لیے امام حسینؓ سینہ سپر ہوگیے تھے، یہ کسی حکمران سے دشمنی کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ ختم ہوتی ہوئی اسلامی اسپرٹ کو بچانے کا مشن تھا۔اس کا فکری پیغام رہتی دنیا تک امت کے لیے حرکت و عمل کا پیغام ہے،معروف کے قیام اور منکر کے ازالے کا پیغام ہے،قران کے اس حکم کی بجا آوری کا پیغام ہے،ومن اظلم ممن کتم شهاده عنده من الله ۔۔۔اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جس کے پاس اللہ کی طرف سے گواہی ہو اور وہ اسے چھپائے ۔۔۔یہ مشن حق گوئی و بیباکی چاہتا ہے۔قولی و عملی شہادتوں کا تقاضا کرتا ہے۔۔۔حق کے سامنے سینہ سپر ہوجانے اور ظلم کا مقابلہ کرتے ہوئے جانیں قربان کردینے کا پیغام دیتا ہے۔

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحب اسرار کرے

دے کے احساس زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

فتنۂ ملت بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

☆☆☆

شاعر خلیج جلیل نظامی۔حیدرآباد دکن

اک غزل احباب کی نذر حسب حال

غزل

وہ نیک نام ہی یہ کار ننگ کرتے ہیں
ملا کے ہاتھ جو دشمن سے جنگ کرتے ہیں

قلم کی نوک سے ہم دے رہے ہیں سرانجام
جو کام جنگ میں تیر و تفنگ کرتے ہیں

زمین کھینچنے والی ہے جانتے ہیں ڈور!
بلند پھر بھی ہوا میں پتنگ کرتے ہیں

کٹورے بھیک کے دو مختلف ہیں، پیشہ ایک
ادھر وہ سادھو،ادھر یہ ملنگ کرتے ہیں

ہمارے اہل سیاست ہیں سب سخن آزار
یہ قافیوں کی طرح دل کو تنگ کرتے ہیں

ہم اپنے کلبۂ احزاں کی چار دیواریں
خود اپنے خون کے روغن سے رنگ کرتے ہیں

حقیر جان کے مت چھیڑ اہل دانش کو
قلم سے لوگ یہ صید نہنگ کرتے ہیں

انا پرست ہیں،ابلیس کے ہیں۔وہ چیلے
جو موم جیسے دلوں کو بھی سنگ کرتے ہیں

عدو کا تیر ہو یا ہمنوا کا طنز خفی
جلیل دونوں ہی دل میں سرنگ کرتے ہیں

: عبدالعلیم الاعظمی

مدارس اسلامیہ کا خود کفیل ہونا مفید یا مضر

تمہید

سرزمین ہندوستان میں مدارس اسلامیہ دینی علوم و فنون کے مرکز، اسلام اور مسلمانوں کی بقا وحفاظت کے عظیم قلعے اور مسلم معاشرہ میں اسلامی اثر ونفوذ کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔ آزادی کے بعد مدارس اسلامیہ کو ہر طریقے سے بند کرنے کی کوشش کی گئی، انہیں دہشت گردی کا اڈہ باور کرایا گیا، کبھی نصاب تعلیم کولیکر تنقید کا نشانہ بنایا گیا، تو کبھی مدارس اسلامیہ کو سرکاری بورڈ سے منسلک کرنے کا شوشہ چھوڑا گیا، نفرت پسند جماعت کے موجودہ اقتدار میں مختلف سروے کے نام پر مدارس کو پریشان کرنا ایک عام بات ہوگئی ہے۔ موضوع بحث عنوان کا تعلق اگرچہ مذکورہ بالا امور سے نہیں ہے؛ لیکن اس طرح کے موقع پر ایک حلقے کی طرف شدت سے یہ بات اٹھائی جاتی ہے کہ مدارس اسلامیہ اگر خود کفیل ہوں تو مدارس کے بہت سے مسائل حل ہوجائیں گے، اسی لئے ان حالات میں مذکورہ عنوان کے دونوں پہلوؤں پر تفصیلی بحث ناگزیر ہے۔ سطور ذیل میں ہم سب سے پہلے مدارس اسلامیہ کے قیام کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہیں، پھر موضوع کے دونوں پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مدارس اسلامیہ کے قیام کا پس منظر

1857ء کے انقلاب کے بعد مسلمانوں کو طرح طرح کی مصائب ومشکلات کا سامنا کرنا پڑا، سرزمین ہند میں اسلام کی بقا مسلمانوں کے لئے ایک اہم مسئلہ بن گیا تھا، عیسائی مشینریوں اور مختلف اسلام مخالف تحریکوں نے انتھک کوشش کی کہ کسی طرح ہندوستان میں اسلام کی روشنی کو ختم کردیا جائے، مسلمانوں کو ان کے مذہب اور تہذیب و تمدن سے دور کردیا جائے، انقلاب کے نتیجے میں علماء کی ایک بڑی تعداد یا تو راہ خدا میں شہید ہوگئی یا پابندِ سلاسل ہوگئی، مزید برآں انگریزی حکومت کے جبر وتشدد کی وجہ سے وہ تمام درسگاہیں اور مدرسے بیک وقت بند ہوگئے، جو نوابین، زمین داران اور امراء کے رحم وکرم پر چلتے تھے، ان حالات میں دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا، دارالعلوم دیوبند کا قیام محض ایک دینی درسگاہ کی بنیاد نہیں تھی؛ بلکہ یہ ہندوستان میں مدارس اسلامیہ کے قیام کی ایک ہمہ گیر تحریک تھی، جس کے نتیجے میں قلیل عرصہ میں پورے ہندوستان میں مدارس کا جال بچھ گیا۔

مکمل خود کفیل ہونے کے نقصانات

مدارس اسلامیہ اگر مکمل خود کفیل ہوجائیں تو اس کو متعدد نقصانات کا سامنا کرنا پڑے گا، ذیل میں ہم ان نقصانات پر روشنی ڈالنے سے قبل مدارس اسلامیہ کے لئے عموما اور دارالعلوم دیوبند کے لئے خصوصا حضرت مولانا قاسم

نانوتوی (بانی دارالعلوم دیوبند) کے متعین کردہ اصول ہشتگانہ کا ذکر کرتے ہیں؛ کیوں کہ ہندوستان کے اکثر مدارس اسی نہج پر قائم ہیں۔ مذکورہ بحث کے تعلق سے اصول ہشتگانہ میں رقم ہے کہ ''اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں، جب تک یہ مدرسہ ان شاءاللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانہ، تجارت یا کسی امیر محکم القوم کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجاء ہاتھ سے جاتا رہے گا، اور امداد غیبی موقوف ہوجائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہوجائے گا۔''(1) مولانا اعجاز احمد اعظمی اس دفعہ کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''مومن کی نگاہِ فراست میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل کا سارا نقشہ موجود تھا، کتنے مدرسے اپنی عمارت، اپنی ظاہری رونق اور سجاوٹ کے اعتبار سے بہت بڑھ چڑھ گئے مگر تعلیم کی افادیت سے یکسر بے فیض ہیں، کیوں کہ انہوں نے اس قیمتی اصول سے انحراف کرلیا۔''(2)

اگر مدارس مکمل خودکفیل ہوجائیں تو درج ذیل خرابیاں پیدا ہوں گی اور نقصانات لاحق ہوں گے:

1۔ عوامی رابطے میں کمی ہوجائے گی، چندوں کی وجہ سے عوام الناس کا علماء اور دین سے جو ربط ہے، وہ ختم ہوجائے گا، بقول مولانا اعجاز احمد اعظمی ''باجود بہت ساری کمیوں اور خرابیوں کے مسلمانوں میں دین وایمان کی چمک دمک کا بڑا حصہ ان مدارس اور ان کے چندوں پر منحصر ہے''(3)

2۔ ذمہ دارانِ مدارس سے جواب دہی کا احساس ختم ہوجائے گا، وہ کسی بھی طرح کے اقدام میں جواب دہ نہیں ہوں گے۔

3۔ منتظمین کے غلط کاموں کی اصلاح مشکل ہوجائے گی؛ کیوں کہ چندوں پر انحصار کی وجہ سے کہیں نہ کہیں یہ احساس رہتا ہے کہ غلطی پر عوام پکڑ کرے گی؛ لیکن خودکفیلی کی صورت میں یہ احساس بھی ختم ہوجائے گا۔

4۔ کرپشن اور غبن وغیرہ میں اضافہ ہوگا، عوامی چندوں پر انحصار کے باجود بھی متعدد مدارس کے منتظمین ومدرسین کی طرف چندوں میں خرد برد کرنے کا معاملہ مشاہدے میں آیا ہے، خودکفیلی کی صورت میں اس میں مزید اضافہ ہوگا۔

5۔ ذمہ داران میں خودمختاری پیدا ہوجائے گی، وہ جیسا چاہیں گے، فیصلہ کریں گے، کسی اصول وضوابط کے پابند نہیں ہوں گے۔

6۔ مدارس جن کی شناخت قومی اداروں سے ہیں، وہ ذاتی اسکولوں اور کوچنگ سینٹروں کی طرح ہوجائیں گے۔

7۔ تعلیمی معیار پست ہوجائے گا؛ کیوں کہ عوامی چندوں پر انحصار کی صورت میں عوام کی مدرسہ کی تعلیم وترقی پر نظر رہتی ہے؛ لیکن خودکفیلی کی صورت میں یہ نظر نہیں رہے گی، جس کی وجہ سے تعلیم معیار گر جائے گا۔

8۔ شورائی نظام کے خاتمے کا امکان ہے، آج مدارس میں کسی نہ کسی نوعیت سے شورائی نظام پایا جاتا ہے؛ لیکن خود کفیلی کے بعد اس کے بھی ختم ہونے کے قوی امکانات ہیں۔

9۔ دعوت وتبلیغ میں کمی ہوگی، مدارس کی طرف سے عوامی اجلاس، اور عوام کی اصلاح کا خاتمہ ہوجائے گا۔

10۔ 1857ء کے انقلاب سے قبل مدارس ومکاتب وغیرہ امراء، زمین داران اور نوابوں کے ماتحت خودکفیل ہوتے تھے، انگریزی حکومت نے ان امراء وغیرہ پر شکنجہ کس

کے بیک وقت تمام مدارس کو بند کر دیا تھا، اسی طرح موجودہ زمانے میں بھی خود کفیلی کے تمام ذرائع پر حکومتی شکنجہ کے بعد مدارس کے یک لخت بند ہونے کے قوی امکانات رہیں گے۔

11۔غریب اور مسکین طلبہ کے لئے مدارس کے دروازے بند ہونے کے قوی امکانات ہیں۔

حضرت مولانا قاسم نانوتوی نے خود کفیل ہونے کی صورت میں درج ذیل چار نقصانات کا ذکر کیا ہے:

12۔خوف ورجاء کا خاتمہ

13۔رجوع الی اللہ کا خاتمہ

14۔امدادِ غیبی موقوف ہو جائے گی۔

15۔کارکنان میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا۔(4)

خود کفیل ہونے کے فوائد

خود کفیل ہونے کے درج ذیل فوائد ہیں:

1۔ منتظمین کو چندے وغیرہ سے چھٹکارہ مل جائے گا۔

2۔ملازمین کو وقت پر تنخواہ ملے گی۔

3۔ گیہوں اور چاول کی وصولی کے نام پر تعلیم کا نقصان نہیں ہوگا۔

4۔ وقت پر تنخواہ اور چندے وغیرہ کی عدم وصولی کی وجہ سے مدرسین کی پوری توجہ تعلیم پر ہوگی۔

5۔مالی امور میں شفافیت آئے گی۔

6۔ مدارس کو اپنی ذرائع آمدنی اور خرچ حکومت کو دکھانے میں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔

7۔صرف چندوں پر انحصار کی وجہ سے مختلف سرکاری پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے، ڈاکٹر خالد اعظمی اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''لیکن حکومت مدارس کی ذرائع آمدنی اور مالیات کی فراہمی پر طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا کررہی ہے اور سرکاری رکاوٹیں لگا کر مدارس اسلامیہ کے پورے نظام کو بند کردینے کے درپے ہے۔ مدارس کی مالیات کی سرکاری آڈٹ، آمدنی کے ذرائع کی چھان بین اور زکاۃ و دیگر ذرائع سے روپیہ جمع کرنے پر حکومتی ایجنسیوں اور اداروں کی مستقل نظر رہنے سے مدارس کو مالیات کی فراہمی لگا تار متاثر ہو رہی ہے اور حکومتی حالات ایسے ہی رہے تو مستقبل میں ان مدارس کو اپنے وجود کی بقا کے لئے مالیات کی فراہمی کے متبادل ذرائع کی تلاش لازمی کرنی پڑے گی، کیوں کہ موجودہ وقت میں آمدنی کی قلت ہی مدارس کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔(5)

8۔اساتذہ کی تنخواہ میں اضافہ ہوگا، جو کہ مدارس سے وابستہ افراد کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔

9۔ نامساعد حالات میں مدارس کو دشواریوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا گا، چناں چہ کوڈ کی وبا اور لاک ڈاون کے دوران زکوۃ وعطیات کی عدم وصولی کے باعث مدارس شدید مالی بحران کا شکار ہو گئے تھے، بیشتر چھوٹے اور درمیانی درجے کے مدارس کو اپنا وجود برقرار رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔(6) حتی کہ متعدد مدراس نے اساتذہ کی تنخواہیں روک دیں اور متعدد مدارس نے نصف تنخواہیں ادا کی تھی۔

10۔مدارس کو چندہ دینے والوں پر حکومتی اداروں کی کڑی نظر ہے، چناں چہ تقریبا دو سال قبل حکومت نے دارالعلوم دیوبند سے چندہ دینے والوں کے آدھار کارڈ نمبر طلب کئے تھے (7) ظاہر سی بات ہے اس کے ذریعہ مسلمانوں میں مالی اعتبار سے مضبوط لوگوں کو پریشان کرنا مقصود ہے، اگر مدارس خود کفیل ہوں تو اس طرح کی صورت حال کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

11۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ چندوں کی وجہ سے علماء نھی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے، اور سماجی مسائل کی اصلاح سے کتراتے ہیں، لیکن اگر مدارس خود کفیل ہوں تو علماء ہر رسم و رواج اور بدعات و خرافات پر کھل کر بولیں گے اور سماجی برائیوں کی اصلاح کریں گے۔

خود کفیل ہونے کا ایک تجربہ

خود کفیل ہونے کا ایک تجربہ مدارس اسلامیہ کا سرکاری بورڈ سے منسلک ہوکر امداد حاصل کرنا ہے، ہندوستان میں متعدد مدارس اس نوعیت کے ہیں؛ لیکن اس کی وجہ سے فائدہ ہونے کے بجائے نقصان ہی ہوا ہے، تعلیمی معیار بالکل ہی پست ہوگیا، عوامی جواب دہی سے بے نیازی نے ان کو یکسر معطل اور بے کار بنادیا۔ اپنے مقصد اصلی سے منحرف ہوگئے اور حکومتی امداد کی وجہ سے حکومتی نصاب کے پابند ہوگئے۔ الغرض کسی بھی نوعیت سے یہ تجربہ مفید ثابت نہیں ہوا۔(8)

محدود پیمانے پر خود کفیل ہونا

سطور بالا میں راقم نے مکمل خود کفیل ہونے کی صورت میں ہونے والے نقصانات کو تفصیلاً ذکر کیا ہے؛ لیکن اگر مدارس اسلامیہ ایک محدود پیمانے تک خود کفیل ہوں، مثلا 50 / فیصد خود کفیل ہوں اور 50 / فیصد چندوں پر انحصار ہو تو مکمل خود کفیل ہونے کے اوپر جو نقصانات بیان کئے گئے ہیں ان میں سے اکثر پیش نہیں آئیں گے اور خود کفیل ہونے کے جو فوائد بیان کئے گئے ہیں ان میں سے اکثر مدارس کو حاصل ہوں گے۔ ذیل میں ہم پہلے خود کفیل ہونے کے بعض اہم طریقوں کا ذکر کرتے ہیں، اس کے بعد موجودہ دور کے مدارس سے اس کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ درج ذیل مشہور طریقے سے مدارس مکمل یا محدود طور پر خود کفیل ہو سکتے ہیں:

1۔ مدارس میں طلبہ پر فیس عائد کی جائے۔

2۔ مدارس کی خالی زمینوں پر زراعت و کاشت کاری کی جائے۔

3۔ مدارس وغیرہ کی دوکان، مکان وغیرہ کرایہ پر دیا جائے۔

4۔ مدارس کی رقم کسی کمپنی میں لگا کر تجارت میں شراکت داری کی جائے۔

5۔ مدارس اسلامیہ سرکاری بورڈ سے منسلک ہوکر حکومتی امداد حاصل کریں۔(اس کی تفصیلات اوپر گذر چکی ہے۔)

محدود پیمانے پر خود کفیل ہونے کی مثالیں

ہندوستان میں مدارس کی بڑی تعداد ایسی ہے جو کسی نہ کسی حد تک محدود پیمانے پر خود کفیل ہے، خواہ یہ خود کفیلی دس پندرہ فیصد ہی کیوں نہ ہو، چوں کہ اس سلسلے میں نہ تو کوئی اعداد و شمار دستیاب ہیں کہ کوئی تفصیلی معلومات فراہم کی جائے؛ البتہ ذیل میں چند طریقہ کار اس کی ایک دو مثالیں درج کی جاتی ہے:

1۔ متعدد مدارس فیس کے ذریعہ خود کفیل ہیں، بطور مثال مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، یہاں فیس کے ذریعہ اتنی رقم اکٹھا ہوجاتی ہے کہ 6 / ماہ کی تنخواہیں اس سے ادا کی جاتی ہے، بقیہ 6 / ماہ کی تنخواہ چندے کے ذریعہ ادا کی جاتی ہے۔(9)

2۔ متعدد مدارس زراعت کے ذریعہ اتنی پیداوار حاصل کرلیتے ہیں کہ پوری سال کے لئے غلہ کافی ہوجاتا ہے، بطور مثال جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں پوری سال کا غلہ

ان کی خود کی زراعت سے حاصل ہوتا ہے۔(10)

3۔متعدد مدارس دوکان ومکان کو کرائے پر دے کر محدود پیمانے پر خود کفیل ہیں، مثلا جامعہ عربیہ احیاء العلوم میں تقریبا10 / لاکھ کی خطیر رقم دوکانوں کے کرائے سے آتی ہے۔(11)

خلاصہ کلام

سطور بالا میں راقم نے اولاً مدارس اسلامیہ کے مکمل خود کفیل ہونے کے نقصانات اور اس کے بعد خود کفیل ہونے کے فوائد پر روشنی ڈالی ہے، اخیر میں راقم نے محدود پیمانے پر مدارس کو خود کفیل بنانے کے فوائد اور اس کی چند مثالیں ذکر کی ہے، راقم نے معروضی انداز میں موضوع کے ہر گوشے اور ہر پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مذکورہ بالا مباحث کی روشنی میں راقم اپنا نقطہ نظر پیش کرتا ہے، جو درج ذیل ہے:

1۔مدارس کو مکمل خود کفیل بنانے کی صورت میں بہت سے نقصانات اور خطرات پیش آئیں گے۔

2۔اگر چہ مدارس کو مکمل خود کفیل بنانے کے بہت سے فوائد ہیں؛ لیکن راقم کی نظر میں اس کے نقصانات فوائد سے زیادہ ہیں۔

3۔مدارس اسلامیہ کو محدود پیمانے پر خود کفیل بنانے کی صورت میں مدارس کو وہ نقصانات اور خطرات لاحق نہیں ہوں گے، جو مکمل خود کفیل ہونے کی صورت میں ممکن ہیں۔

4۔موجودہ حالات میں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ مدارس اسلامیہ کو محدود پیمانے یعنی تیس سے پچاس فیصد تک خود کفیل بنایا جائے، مابقیہ کے لئے چندے وغیرہ پر انحصار کیا جائے۔ اس کی وجہ سے جہاں مدارس کے بہت سے مسائل حل ہوں گے وہیں مدارس میں تعلیمی، انتظامی اور تدریسی اعتبار سے ترقی ہوگی، کسی بھی نامساعد حالات میں مدارس کو اس صورت حال کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا، جو وبائی دور میں پیش آیا تھا۔

مصادر ومراجع

(1) مولانا محمد اللہ قاسمی، دارالعلوم دیوبند کی جامع ومختصر تاریخ، شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند، 2016، صفحہ: 54

(2) مولانا اعجاز احمد اعظمی، مدارس اسلامیہ مشورے اور گزارشیں، مکتبہ ضیاء الکتب خیر آباد، 2010ء، صفحہ: 189

(3) مصدر سابق صفحہ: 186

(4) مولانا شوکت علی قاسمی، مدارس اسلامیہ: حقیقی کردار اور نصب العین کا تحفظ، مرکزی دفتر رابطہ مدارس اسلامیہ دارالعلوم دیوبند، 2015ء صفحہ: 12

(5) ڈاکٹر خالد اعظمی، عکس تحریر: جدید تعلیمی ومعاشی مسائل کا تجزیہ، براؤن بکس علی گڑھ، 2023ء صفحہ 46

(6) مصدر سابق، صفحہ: 47

(7) دارالعلوم دیوبند نے اپنے ایک اعلان میں اس کا ذکر کیا تھا، راقم کی نظر سے یہ اعلان گزرا ہے؛ لیکن تلاش بسیار کی باوجود مل نہیں سکا۔

(8) مولانا شوکت علی قاسمی، دارالعلوم دیوبند اور مدارس اسلامیہ، مرکزی دفتر رابطہ مدارس اسلامیہ دارالعلوم دیوبند، 2018ء، صفحہ: 38/37

(9) معلومات از ڈاکٹر خالد اعظمی (پروفیسر شعبہ معاشیات شبلی کالج)

(10) معلومات از مفتی یاسر قاسمی (ناظم اعلی مدرسہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور)

(11) مصدر سابق

☆☆☆

ڈاکٹر ناظر حسین خان۔ شعبۂ اردو کرائسٹ چرچ کالج دی مال، کانپور (یوپی)

پری ناز اور پرندے ایک تنقیدی مطالعہ (قسط اول)

اپنے استاد محترم پروفیسر سراج الدین اجملی سے گفتگو کے دوران اس ناول کا نام سنا تھا لیکن گزرتے وقت اور واقعات کے ساتھ یہ بات بھی ذہن سے نکلتی گئی، ایک بار پھر استاد محترم نے اس ناول کا تعارف یہ کہتے ہوئے کرایا کہ انیس اشفاق کا یہ ناول اردو کا پہلا ایسا ناول ہے جو کسی دوسرے ناول کے متن کی تحقیق پر مبنی ہے بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ پھر راقم نے اس ناول کو پڑھا اور تب بات واضح ہوئی کہ اس ناول میں ناول نگار طاؤس چمن میں کیا ہوا تھا اس کی تلاش ایک راوی کے ذریعے کرواتا ہے اور اصل میں طاؤس چمن میں کیا ہوا تھا اس کا ذکر اس پورے ناول میں نہیں ہے۔ اس کو جاننے کے لیے نیر مسعود صاحب کا افسانہ 'طاؤس چمن کی مینا' پڑھنا پڑے گا۔ افسانہ پڑھنے کے بعد ایک اور بات واضح ہوتی ہے کہ اگر افسانہ 'طاؤس چمن کی مینا' نہیں ہوتا تو ناول 'پری ناز اور پرندے' وجود میں نہیں آتا کیوں کہ 'پری ناز اور پرندے' میں راوی پورے ناول میں راوی اور فرش آرا سے صرف اور صرف اسی بات کی تلاش کرواتا ہے کہ طاؤس چمن میں کیا ہوا تھا اور جب ناول میں یہ جاننے کی باری آتی ہے کہ اصل میں طاؤس چمن میں کیا ہوا تھا اس وقت ناول نگار طاؤس چمن کے واقعے کا ذکر مختصر میں کر کے آگے بڑھ گئے ہیں۔ یعنی کہ اگر قاری یہ جاننے کی خواہش رکھتا ہے کہ اصل میں طاؤس چمن میں کیا ہوا تھا تو اس کو نیر مسعود کا افسانہ 'طاؤس چمن کی مینا' پڑھنا ہی پڑے گا۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ انیس اشفاق نے اپنے ناول 'پری ناز اور پرندے' کے ذریعے نیر مسعود کے افسانے 'طاؤس چمن کی مینا' کو بہت ہی سلیقے سے آگے بڑھایا ہے۔ موجودہ دور میں اردو ادب میں موجود تمام لوگوں میں انیس اشفاق ان ناموں میں ایک نام ہے جو کسی کے ذریعے شروع کی گئی روایت کو اسی کے انداز میں بہت ہی سلیقے سے آگے بڑھاتے ہیں یہ کام انیس اشفاق جیسے لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ بلا شبہ شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ اور شمیم حنفی کے بعد انیس اشفاق ہی وہ شخصیت ہے جو اس کام کو خوب صورتی سے انجام دے سکتے ہیں۔

انیس اشفاق نے اپنے ناول 'پری ناز اور پرندے' کے ذریعے نیر مسعود کا افسانہ 'طاؤس چمن کی مینا' کی روایت کو آگے بڑھایا ہے اس آگے بڑھانے کی روایت کو اس انداز میں بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ ناول 'پری ناز اور پرندے' کے ذریعے افسانہ 'طاؤس چمن کی مینا' کا اشتہار کیا گیا ہے۔ کیوں کہ پری ناز اور پرندے کے پورے حصے میں صرف اور صرف کہانی کا مرکز یہی رہا ہے کہ طاؤس چمن میں کیا ہوا تھا، طاؤس چمن کے قصے کو جاننے کے لیے راوی سے بہت محنت کرائی گئی، پورے ناول میں ناول نگار کے ذریعے یہ تجسس باقی رکھا گیا کہ طاؤس چمن میں کیا ہوا تھا، قاری بھی اسی تجسس میں پورے ناول کو پڑھتا ہے کہ اصل میں طاؤس چمن میں کالے خان کے ساتھ ہوا کیا تھا، کالے خاں نے ایسی کیا غلطی کی تھی، ناول میں ناول نگار کے ذریعے بار بار کئی کرداروں سے کالے خان اور طاؤس چمن کا ذکر کرایا گیا مگر یہ

راز کہیں نہیں کھولا گیا کہ طاؤس چمن میں کیا ہوا تھا، جہاں جہاں بھی اس کا ذکر آیا ناول نگار بہت ہی سلیقے سے اس کا ذکر کرنے سے بچتا ہے اور جب یہ جاننے کی باری آتی ہے کہ طاؤس چمن میں کیا ہوا تھا اس وقت قاری کے تجسس کو برقرار رکھتے ہوئے بہت ہی چالاکی سے ناول نگار کے ذریعے اس پورے حصے کو غائب کر دیا جاتا ہے تاکہ طاؤس چمن کے واقعے کو جاننے کے لیے قاری افسانہ 'طاؤس چمن کی مینا' کو پڑھے۔ اور ناول نگار صد فیصد اپنے اس اشتہار میں کامیاب بھی ہوتے ہیں۔

یہاں پر ناول نگار کا ایک اور کمال دیکھنے کو ملتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر ناول کی کوکھ سے ناولٹ یا افسانہ جنم لے تو کوئی حیرت کی بات نہیں مگر ایک افسانے کے بطن سے ناول کا پیدا ہونا یا پیدا کرانا یہ بھی ناول نگار کا ایک کمال ہے اور ایسا کمال پروفیسر انیس اشفاق جیسے لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ مذکورہ بالا باتوں کا ایک طنزیہ پہلو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عام طور پر IAS کی تیاری کرنے پر اگر طلبہ IAS کو الفائی نہیں کر پائے تو کم سے کم PCS نہیں تو اس سے بھی کم لیکھ پال یا کلرک کا امتحان تو پاس کر ہی لیتے ہیں مگر یہاں تو الٹا ہوا ہے لیکھ پال اور کلرک کی تیاری کرنے والا PCS بھی نہیں سیدھے IAS بنا دیا جاتا ہے۔ یعنی کہ افسانے سے ناولٹ نہیں بلکہ سیدھے ناول پیدا کیا گیا ہے۔ (اس پورے مضمون میں تنقید کے دوران اکثر جگہوں پر طنز سے بھی کام لیا گیا ہے، اس لیے اس کو طنزیہ تنقید کے طور پر لیا جائے) ناول کی اس تنقید کو کئی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

الف: کیا ناول میں ناول نگار کے ذریعے دکھائی گئی سہولتیں اس وقت اس طرح سے موجود تھیں:

زمانی اعتبار سے 'پری ناز اور پرندے' میں تقریباً سنہ ۱۹۰۰ء کے درمیان کی واقعات پیش کیے گئے ہیں، ناول نگار کے ذریعے ناول میں کچھ ایسی چیزوں کا ذکر مثلاً چائے، نل، مٹی کا تیل اور اسٹوو غیرہ کا کیا گیا ہے، یہاں یہ امر تحقیق طلب ہے کہ یہ چیزیں اس دور میں موجود تھیں اور اگر موجود تھیں تو کیا وہ اس قدر عام تھیں جس طرح ناول نگار نے اپنے ناول میں دکھایا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے چائے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ لفظ چائے کا ذکر ناول نگار نے کئی جگہوں پر کیا ہے اس میں سے کچھ جگہیں تو قابل قبول ہیں مگر فرش آرا کے گھر پر چائے کا ہونے کا ذکر ان کے حالات کے اعتبار سے ایک سوال پیدا کرتا ہے۔ سب سے پہلے فرش آرا کے گھر پر چائے کے ذکر کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''اماں انہیں چائے پانی کو تو پوچھیے۔۔۔۔ چائے پئیں گے یا شربت؟'' ص۔۷۷

اور ایسا نہیں ہے کہ محض رسماً پوچھا گیا ہو فرش آرا چائے بنانے بھی جاتی ہیں:

''فرش آرا چائے بنانے چلی گئیں تو میں۔۔۔'' ص۔۷۸

''اتنی دیر میں فرش آرا چائے بنا کر لے آئیں۔'' ص۔۷۸

سوال یہ نہیں کہ فرش آرا کے گھر پر چائے کیوں ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ ناول نگار نے ناول میں فرش آرا کی غربت کا ذکر جس انداز میں خود فرش آرا کی زبانی کروایا ہے اس سے یہ سوال پیدا ہونا لازمی ہے۔ رام دین کی دکان پر راوی اور فرش آرا کے درمیان کا ایک مکالمہ ملاحظہ فرمائیے:

''ہے لیکن شوق پورا کرنے کے لیے پیسے چاہیے اور وہ ہمارے پاس نہیں ہیں۔'' یہ کہہ کر لڑکی بولی: ''پنجرے بک جاتے ہیں تو چولہا جل جاتا ہے نہیں بکتے تو۔۔۔''

''تو۔۔؟''

''ٹھنڈا رہتا ہے۔'' ص۔۳۱

فرش آرا کے گھر کی حالت جب ایسی ہے کہ پنجرے بکنے

پر ہی گھر کا چولہا جلتا ہے ورنہ ماں بیٹی دونوں بھوکی رہتی ہیں۔ اب ایسے میں ان کے گھر میں چائے کا ہونا ایک تنقید طلب موضوع ہے۔

اس کے بعد سوال نل پر ہے۔نل کا سوال بھی اسی نوعیت کا ہے کہ نل کا ہونا یا نا ہونا بہت معنی نہیں رکھتا مگر ان گھروں میں جن کا ذکر ناول نگار نے کیا ہے کے حالات کے اعتبار سے وہاں نل کا ہونا ایک سوال پیدا کرتا ہے۔ راوی ایک کرائے کے مکان میں رہتا ہے اس کا تعلق کسی اہل ثروت گھرانے سے نہیں لگتا پھر بھی اس دور میں راوی کے مکان میں نل کا ہونا بحث کو دعوت دیتا ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''فرش آرا نے برتن سمیٹے۔نل پر انہیں دھو کر تھیلے میں رکھا'' ص۔۱۵۱

راوی کے گھر تک تو ٹھیک تھا ناول نگار نے فرش آرا کے گھر پر بھی نل دکھایا ہے۔

''سورج ڈوب چکا تھا۔ رام دین اور اس کے ساتھ آنے والے کاریگر نے کام ختم کر کے نل پر ہاتھ پاؤں دھوئے اور فرش آرا سے چلنے کی اجازت لی۔'' ص۔۲۷۸

یہ منظر اس وقت کا ہے جب راوی رام دین کے ساتھ مل کر فرش آرا کے گھر پر ۴۰ میناؤں کے لیے ایک بڑا سا پنجرہ تیار کرواتا ہے۔ ناول میں ان دونوں کے گھر کے علاوہ عیش باغ میں بھی نل دکھایا گیا ہے:

''۔۔۔کھانا کھانے کے بعد ہم نے باغ کے نل پر جا کر پانی پیا۔۔۔'' ص۔۱۳۳

باغ میں نل کا ہونا یعنی کہ نل ان دنوں میں اس قدر عام ہو گیا تھا کہ ہر جگہ اس کی دستیابی تھی۔ اس کے علاوہ ناول نگار نے راوی کے کمرے میں اسٹو اور مٹی کے تیل کو بھی دکھایا ہے:

''۔۔۔چولہے کے پاس مٹی کے تیل کی ایک بوتل ہے، اسی کے منہ پر دیا سلائی رکھی ہے۔ سائبان کے باہر پیڑ کے تنے سے لگا ہوا سوکھی لکڑیوں کا ڈھیر ہے۔ چبوترے پر ایک پیتل کا اسٹو بھی ہے لیکن وہ بڑی مشکل سے جلتا ہے۔''

ص۔۱۶۵۔۱۶۶

مزید یہ کہ گیس کی لالٹین کا بھی ذکر کیا گیا ہے وہ بھی ایک نہیں بہت سی:

''۔۔۔میں نے گیس کی بہت سی لالٹینوں کی روشنی میں صاحب کی کھدی ہوئی قبر کے آس پاس والی قبروں کو دیکھنا شروع کیا تو اچانک میری نگاہ ایک کتبے پر ٹھہر گئی۔'' ص۔۲۸۴

اس دور میں اگر ناول نگار نے مٹی کا تیل، اسٹو اور گیس کی لالٹین کا ذکر کیا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تمام چیزیں اس وقت میں واقعی موجود تھیں یا ناول نگار نے کہانی کو بنانے کے لیے ان چیزوں کو وہاں مہیا کرایا ہے۔

ناول کے حوالے سے سوالوں کے اس سلسلے کی اگلی کڑی میں ناول میں استعمال کیے گئے کچھ الفاظ سے ہے۔ اس باب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے

۱۔ ہندی الفاظ اور غیر روایتی الفاظ کا استعمال

۲۔ غیر مہذب الفاظ کا استعمال

ہندی الفاظ اور غیر روایتی الفاظ کا استعمال:

'ہندی الفاظ کا استعمال' کے اس حصے کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں غیر مسلم کردار کی گفتگو میں استعمال ہندی الفاظ کو شامل کیا گیا ہے اور دوسرے حصے میں مسلم کرداروں کی زبان سے ادا کروائے گئے غیر روایتی الفاظ پر بحث کی گئی ہے۔

الف۔ ہندی الفاظ کا استعمال

پہلے حصے کی بات کریں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ ناول نگار نے اس بات کا پورا خیال رکھا ہے کہ کردار جس ماحول کا ہے اس سے اسی طرح کے الفاظ استعمال کروائے جائیں تا کہ اس سے اس کی اصلیت ظاہر ہو یعنی اگر کردار غیر تعلیم یافتہ ہے تو اس سے لفظ کی ادائیگی میں اسی طرح سے کام لیا جائے، اس سلسلے میں سب سے پہلے لکڑ ہارے کے مکالمے کو ملاحظہ کیجیے:

''ندّی کی طرپھ۔ چڑیا دانہ یہاں چگتی ہے، پانی وہاں جا کر پیتی ہے۔'' ص۔۲۱

''بندروں سے کوئی جگہ کھالی نہیں۔۔۔۔'' ص۔۲۱

''کس طرپھ سے آئے ہو؟'' ص۔۲۱

''آج مہروا سنگ نہیں آئی۔۔۔۔اُدھر ندّی کی طرپھ جاؤ گے یا واپس جنگل سے باہر'' ص۔۲۲

''دیکھو جرور دیکھو۔۔۔۔۔۔جس طرف وہ جال بچھا ہو اس طرپھ مت جانا۔'' ص۔۲۲

''چڑیا ہشک جائے گی اور چڑی مار تم پر کھفا ہوں گے۔''

ص۔۲۲

''۔۔۔گھام پھیلتی ہے تو وہ خود ہی درخت چھوڑ دیتی ہے۔'' ص۔۱۷۷

ان جملوں میں ناول نگار نے لکڑ ہارے کی طرف سے جو الفاظ طرپھ، کھالی، مہروا، جرور ، کھفا اور گھام وغیرہ تلفظ کی غلطیوں کے ساتھ ادا کروائے ہیں اس سے یہ تو پوری طرح ظاہر ہوتا کہ ناول نگار نے کردار کے الفاظ سے اس کی شبیہ کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے اور بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں مگر ناول نگار لکھنو میں رہ کر بھی یہ بھول گئے کہ یہ کردار اصل میں لکھنو کے ہیں اور لکھنو کی زبان بہت مشہور ہے۔ یہاں تک کہ لکھنو کے رکشے والوں کی بہترین زبان پر آج بھی لطیفے بنتے ہیں پھر یہ لکڑ ہارا جس کا تعلق اس ناول میں ان رکشے والوں کے وقت کے اور بھی بہت پہلے کے وقت کا دکھایا گیا ہے کہ جب لکھنؤ کی زبان کی طوطی بولا کرتی تھی، تو پھر ان لکڑ ہاروں کی زبان اس قدر بلا تلفظ کے کیسے ہو سکتی ہے۔ اگر اس لکڑ ہارے کا تعلق لکھنو شہر سے میلوں دور کا ہوتا تو یہ زبان قابل قبول تھی مگر لکھنو شہر کے اس لکڑ ہارے کی یہ زبان جو ناول نگار نے اس ناول میں پیش کیا ہے وہ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

دوسری مثال ہم ملاحوں کی زبان کی لیتے ہیں:

''باب کی سمادھی یہیں بنے گی اور پکی بنے گی۔''

ص۔۲۶۲

یہاں پر لفظ سمادھی بحث طلب ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ۱۹۰۰ء میں لکھنو میں لفظ 'قبر' کی جگہ 'سمادھی' عام لوگوں کی زبان پر تھی؟ آج کے دور میں بھی کسی مسلم بابا کے انتقال کے بعد غیر مسلم بھی ادب سے لفظ 'مزار' کا استعمال کرتے ہیں یہ تو پھر بھی لکھنو شہر کے آج سے ۱۲۵ برس پہلے کا مکالمہ ہے اس وقت میں لفظ 'سمادھی' کا استعمال سوال پیدا کرتا ہے۔ لکھنو کے ادبی ماحول کو نظر میں رکھتے ہوئے ملاحوں کے کچھ اور مکالمے ملاحظہ کیجیے:

''۔۔۔۔سنگھاسن تو ان کا اسی طرف ہے۔'' ۔۔۔۔۔اس دریا پار اور اُس جنگل پر انہیں کا راج ہے۔ ہم سب ان کی پرجا ہیں۔'' ص۔۳۵

''سویں برس میں ہوں۔ وشواس کروگے میری بات کا۔۔'' ص۔۲۵۳

''۔۔۔۔وہ ہماری گومتی کا گہنا تھی۔'' ص۔۲۵۳

''۔۔۔۔جاؤ دوبارہ آنا اور کوئی بتائے ہم نہیں رہے تو ہماری آتما کی شانتی کے لیے دعا کرنا۔'' ص۔۲۵۴

اس حصے کے مثال میں جتنے بھی الفاظ پیش کیے گئے ہیں ان سبھی تنقید کی یہ نظر رکھنی ہے کہ کیا لکھنو میں اس وقت میں ہندی

کے یہ الفاظ عوام کی زبان پر تھے؟ مذکورہ مثالوں میں لفظ وشواس، طرپھ اور کھفا کو ایک حد تک ان کرداروں کی زبان تسلیم کر بھی لیا جائے تو راجا، پرجا، سنگھاسن اور مہرواسنگ نہیں آئی وغیرہ الفاظ کسی طرح گلے نہیں اترتے کہ اس طبقے کے لوگ بھی لکھنو شہر میں رہ کر اپنی روزمرّہ کی زبان میں اس طرح کے الفاظ کا استعمال کرتے ہوں۔

بحث کے اس حصے میں کردار رام دین کے مکالمے میں استعمال الفاظ ایک خاص توجہ کے حامل ہیں، اس کی وجہ کے ذکر سے پہلے رام دین کے ذریعے استعمال الفاظ ملاحظہ کریں:

''اتنے دن میں جان گیا ہوں اور جیسے پنجرے تم نے خریدے ہیں اس سے وشواس ہو گیا ہے تم جب بھی خریدو گے، اچھا پرندہ خریدو گے'' ص۔۱۴

''یہ تھوڑی بتایا کتنے سال کے ہو۔ بس یہ کہا تمھاری ہی عمر کے ہیں۔ ایک دو برس کا انتر ہو تو ہو۔'' ص۔۱۵

''ایک اچھر تو ہم نے پڑھا نہیں۔۔۔۔۔'' ص۔۱۰۲

''اور ہاں رام گنج جا کر، یہیں قریب میں تو ہے، چوراہے پر سے ایک راج گیر لے آؤ۔۔۔۔۔'' ص۲۷۶

''کیسی بات کرتی ہو بیٹا۔ تم رام دین کی بیٹی جیسی ہو۔ بیاہ والے دن ہمیں یاد رکھنا۔'' ص۔۲۷۸

''بٹیا سندر بھی ہیں، سشیل بھی۔ جس کے ساتھ رہیں گی وہ بہت خوش رہے گا۔۔۔'' ص۔۲۷۸

رام دین کے ذریعے استعمال میں لائے گئے ان الفاظ اور جملوں کے بعد رام دین کے ماحول پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ ماحول سے مراد رام دین کے پیشے سے ہے۔ پرندہ اور پنجرہ بیچنے کا پیشہ رام دین کے دادا کے زمانے سے ہے اور اس کی دکان کوئی معمولی دکان بھی نہیں ہے۔ یہ اقوال ملاحظہ کریں جس سے مذکورہ باتیں ثابت ہوتی ہیں:

''رام دین۔ بازار میں آدھے سے زیادہ چڑیاں میری ہیں اس لیے لوگ سب سے پہلے مجھی کو پوچھتے ہیں۔'' ص۔۱۲

''برسوں ہو گئے اس ٹھیے پر چھوٹی سے بڑی چڑیا بیچتے۔ دادا آئے تھے یہاں پنجرے لے کر۔ تب سے اس پیڑ کے نیچے انہیں رکھنے اٹھانے کا کام کر رہے ہیں۔'' ص۔۱۵

''یہاں جو بتایا ہوگا باپو نے بتایا ہوگا یا ان کے باپ نے۔ بازار تو انہیں کا بسایا ہوا ہے۔'' ص۔۱۷۰

اس زمانے میں پرندہ پالنا عام لوگوں کا شوق نہیں ہوتا تھا۔ نواب یا دربار سے تعلق رکھنے والے لوگ ہی یہ شوق رکھتے تھے (ٹھیک ویسے ہی جیسے آج کل کے بڑے گھروں کے لوگ کتے وغیرہ پالتے ہیں) اور اس وقت ایسے لوگوں کی زبان جن کا تعلق دربار سے ہو اردو ہوتی تھی۔ اب ایسے میں رام دین کا سابقہ اپنی دکان پر ایسے ہی لوگوں سے پڑتا رہا ہوگا۔ زبان کے ہی حوالے سے بابا اور ارجن ملاح کا ایک مکالمہ ملاحظہ کیجیے:

''اب جنگل جا کر کیا کروں گا۔ وہاں کی ساری دولت تو اٹھا لایا۔ میں نے کہا بابا میں سمجھا نہیں تو چڑیوں کے پنجروں کی طرف دیکھ کر بولے: 'سلطانِ عالم کی سلطنت کا سب سے بڑا رئیس تمہارے سامنے کھڑا ہے اٹھو اور سلام کرو۔' یہ کہہ کر جھونپڑی سے نکل گئے۔'' یہ بتا کر ارجن ملاح ہنس کر بولا: ''وہ تو کہو دریا سے نوابوں کی بستی بہت قریب ہے، اس لیے ہم ایسی باتیں سمجھ لیتے ہیں ورنہ۔۔۔۔'' ص۔۲۵۷

اس قول کی روشنی میں ناول نگار سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب نوابوں کی بستی کے قریب رہنے والے ملاحوں کا یہ عالم ہے کہ اس طرح کی زبان سمجھنا ان کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے، تو پھر نوابوں اور درباریوں کے درمیان کاروبار کرنے والے رام دین سے ایسی زبان کے استعمال کی امید نہیں کی جا سکتی ہے۔

جاری...........

ڈاکٹر درخشاں عندلیب خان۔پی۔ایچ۔ڈی، ایجوکیشن،ایم فیل،ایم۔ایڈ،ایم۔اے۔انگلش،ہسٹری۔ہوم ایکونومیک،عربی،اردو

غالب کے خطوط کی ادبی وتاریخی اہمیت

مرزا غالب جتنے بڑے شاعر تھے اتنے ہی بڑے نثر نگار بھی تھےانہوں نے اردو میں چند کتابوں پر غوروفکر کیا اور دو ایک چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھی لیکن ان کی زبان فسانہ عجائب کی زبان کی طرح مصنوعی اور پیچیدہ ہے اس لیے ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں لیکن انہوں نے اردو میں جو خطوط لکھے ان سے اردو نثر کی ترقی میں بہت زیادہ مدد ملی غالب کے زمانے میں فارسی میں خطوط لکھنے کا رواج تھا خود غالب بھی پہلے فارسی میں خط لکھا کرتے تھے لیکن ایک زمانے میں مصروفیت اور خرابی صحت کی سبب وہ اردو میں خط وکتابات کرنے لگے اور وہ بھی قلم برداشتہ مطلب یہ کہ قلم اٹھایا اور بغیر کسی تیاری کے جو کچھ سمجھ میں ایا لکھ دیا یہ بے تکلف انداز اتنا پسند کیا گیا کہ انہوں نے مکتوب مویشی کے لیے فارسی کی جگہ اردو کو اپنا لیا خط وکتابت کا انہیں بہت شوق تھا خود ان کا بیان ہے کہ دن کا زیادہ حصہ خط لکھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا تھا کوئی جواب نہ دے یا جواب میں دیر کرے تو انہیں بہت ناگوار گزرتا تخط کو ادھی ملاقات کہا جاتا ہے غالب نے اسے پوری ملاقات بنا دیا معلوم ہوتا ہے خط نہیں لکھ رہے ہے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں ایک جگہ بڑے فخر کے ساتھ لکھتے ہیں۔

مراسلے کو مکالمہ بنادیا

میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے سوکوس'' سے بے زبان قلم باتیں کیا کرو ہجر میں وصال کے زے لیا کرو''

القاب واداب کا خاتمہ

ان کا مزاج نرالا تھا کسی کی پیروی ک باعثِ شرم وخیال کرتے تھے ہر معاملے میں اپنا راستہ اپ نکالتے تھے اور وہ بھی سب سے الگ اس زمانے میں مکتوب نگاری کا جو انداز تھا اور وہ بھی فارسی میں غالب نے اسے رد کر کے نیا انداز ایجاد کیا مثلا اس دور میں لمبے لمبے القاب واداب کا رواج تھا انہوں نے مختصر سے مختصر القاب لکھے جیسے بھائی صاحب مہاراج میری جان بندہ پرور کہیں مکتوب الہی یعنی جس کو خط لکھ رہے ہیں اس کا نام لیا اور بات شروع کر دی۔

ایجاز واختصار

غالب کے خطوط میں سادگی سلاست اور بے تکلفی کے ساتھ ایجاز واختصار کا وصف بھی موجود ہے وہ خطوط میں صرف ضروری اموار کو تحریر کرتے ہیں اور فالتو چیزوں کے بیان سے پرہیز کرتے تھے ان کے جملے مختصر اور بر محل ہوتے ہیں تاہم شعوری اور غیر شعوری طور پر وہ مکفیہ عبارت بھی لکھ جاتے ہیں جس سے تحریر میں حسن پیدا ہو جاتا ہے اور قادری لطیف۔

حیات غالب کا مرقع

خطوط غالب کے ذریعے ہمیں غالب کی زندگی کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہےخطوط غالب کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے خاندان کے اپنے اباد واجداد کے

اور خود اپنے مکمل حالات بیان کر دیے ہیں حد یہ ہے کہ غالب نے ان باتوں کو بھی نہیں چھپایا جنہیں اکثر لوگ چھپا جاتے ہیں مثلاً ان خطوط میں غالب نے شراب نوشی کا ذکر موجود ہے ایک ڈومنی انہیں چاہتی تھی یہ بات بھی صاف صاف بتا دی ہے اپنی تنگ دستی اور مہاجن سے قرض لینے کی کا حال لکھ دیا یہ خط غالب کی مکمل سوانح عمری ہیں غالب کے زمانے کی دلی کو دیکھنا ہو تو غالب کے خطوط کی ورق گردانی کیجئے غدر کے حالات دلی کا اجڑنا بے گناہوں کا مرنا یا ان کی سزا پانا سبھی کچھ ان میں موجود ہے غالب نہایت شگفتہ مزاج تھے شوخی ظرافت اور طبیعت میں داخل تھی جبھی تو حالی نے انہیں حیوان ظریف کہا ہے یہ خطوط لطیفوں چٹکلو اور دلچسپ باتوں سے بھرے بھرے پڑے ہیں یہ سمجھنا غلط ہے کہ غالب نے ان خطوط میں صرف بول چال کی زبان استعمال کی ہے عالمی معاملات کے سلسلے میں انہوں نے عالمی زبان کا استعمال کیا ہے اردو میں استدلالی نثر سرسید کا کارنامہ خیال کیا جاتا ہے لیکن خطوط غالب میں استد لالی نثر کے نمونے بھی مل جاتے ہیں۔

اردو مکتوب نگاری میں غالب کا مقام

غالب کی شاعرانہ حیثیت سے انکار ممکن نہیں اس کے علاوہ سادہ سلیقے اور شگفتہ نثر نگاری کی ابتدا کا سہرا بھی ان کے سر ہی بندھا ہوا ہے ان کی نثر سرمایہ یہی خطوط ہے جو انہوں نے مختلف اوقات میں اپنے دوستوں اور شاگردوں کو لکھے یہ غالب ہی تھے جنہوں نے مشکل اور پیچیدہ انداز بیان ترک کر کے سادگی سلاست اور روانی اور شگفتگی کو اپنایا گفتگو اور بول چال کے انداز بیاں سے مراسلے کو مکالمہ کا روپ دے دیا اس انداز بیاں سے خطوط میں زندگی کا احساس پیدا ہوتا ہے اور پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ جیسے وہ کسی جیتے جاگتے ماحول میں بیٹھا ہو اور واقعات اپنی انکھوں سے دیکھ رہا ہو خطوط غالب نے اردو نثر کو ایک نئے موڑ سے ہم کنار کرنے ایک اہم کردار نبھایا ہے۔

فلسفانہ نظریات و خیالات

خطوط غالب جہاں غالب نے اپنے بعض اشعار کی وضاحت کی ہے وہاں زندگی اور کائنات کے بارے میں اپنے مخصوص نظریات اور خیالات کا اظہار بھی کیا ہے۔

خطوط غالب کے ذریعے ہمیں غالب کی زندگی کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیںخطوط غالب کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے خاندان کے اپنے اباد واجداد کے اور خود اپنے مکمل حالات بیان کر دیے ہیں حد یہ ہے کہ غالب نے ان باتوں کو بھی نہیں چھپایا جنہیں اکثر لوگ چھپا جاتے ہیں مثلاً ان خطوط میں غالب نے شراب نوشی کا ذکر موجود ہے ایک ڈومنی انہیں چاہتی تھی یہ بات بھی صاف صاف بتا دی ہے اپنی تنگ دستی اور مہاجن سے قرض لینے کی کا حال لکھ دیا یہ خط غالب کی مکمل سوانح عمری ہیں غالب کے زمانے کی دلی کو دیکھنا ہو تو غالب کے خطوط کی ورق گردانی کیجئے غدر کے حالات دلی کا اجڑنا بے گناہوں کا مرنا یا ان کی سزا پانا سبھی کچھ ان میں موجود ہے غالب نہایت شگفتہ مزاج تھے شوخی ظرافت اور طبیعت میں داخل تھی جبھی تو حالی نے انہیں حیوان ظریف کہا ہے یہ خطوط لطیفوں چٹکلو اور دلچسپ باتوں سے بھرے بھرے پڑے ہیں یہ سمجھنا غلط ہے کہ غالب نے ان خطوط میں صرف بول چال کی زبان استعمال کی ہے عالمی معاملات کے سلسلے میں انہوں نے عالمی زبان کا استعمال کیا ہے اردو میں استدلالی نثر سرسید کا کارنامہ خیال کیا جاتا ہے لیکن خطوط غالب میں استدلالی نثر کے نمونے بھی مل جاتے ہیں۔

☆☆☆

شاکرہ شیخ۔ ریسرچ اسکالر (پی ایچ ڈی) سری وینکٹیشورا یونیورسٹی، تروپتی

صادقہ نواب سحر کی افسانہ نگاری

صادقہ نواب سحر کئی لحاظ سے منفرد کی حامل ہیں۔ کیوں کہ ایک طرف وہ خواتین فکشن نگاروں میں منفرد شناخت رکھتی ہیں۔ دوسری طرف وہ نہ صرف افسانے لکھتی ہیں بلکہ ناول، ڈرامے اور شاعری کی دنیا میں بھی قسمت آزماتی ہیں۔ اس لیے یہ کہنا بجا ہوگا کہ وہ کسی ایک صنف میں قید ہو کر نہیں رہ رہی ہیں۔ جس طرح ان کا ذہنی کینوس وسیع ہے، اسی طرح ان کے صنفی معاملات میں بھی کشادگی نظر آتی ہے ۔ یہاں صادقہ نواب کی ایک اہم خصوصیت کا تذکرہ لازمی ہے کہ وہ جنوبی ہند کی توانا آواز ہیں۔ گویا وہ جنوبی ہند سے نہ صرف خواتین کی نمائندگی کر رہی ہیں ، بلکہ اپنے اچھوتے موضوعات کی وجہ سے مکمل اردو فکشن میں ایک مکمل شناخت رکھتی ہیں۔

صادقہ نواب کے افسانوں میں کوئی ایک رنگ واضح نہیں ہوتا ہے۔ جس کی بنیاد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ متنوع موضوعات سے رشتہ استوار کرتی ہیں۔ بلاشبہ صادقہ نواب سحر نے عورتوں کے مسائل پر توجہ دی ہے مگر ان کے سرمایۂ ادب میں فقط عورتوں کے مسائل ہیں، بلکہ انھوں نے حالات کا نوحہ پیش کیا ہے۔ سیاسی معاملات پر توجہ دی ہے۔ بچوں کی نفسیات کو ابھارا ہے۔ یہی سبب ہے کہ صادقہ نواب کی ادبی دنیا وسیع نظر آتی ہے۔ صادقہ نواب جہاں افسانہ بننے میں غور وفکر کرتی ہیں، وہیں وہ موضوعات کے انتخاب میں بھی چھان پھٹک سے کام لیتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں جلدی بازی نظر نہیں آتی ہے۔ انھوں نے سوچ سمجھ کر موضوعات کا انتخاب کیا ہے، ساتھ ہی انھوں نے کسی ایک فکشن نگار کا رنگ اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا ہے۔ ذیل میں ان کے چند افسانوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

''بیچ ندی کا مچھیرا'' ایک شاندار کہانی ہے۔ جس میں مچھیرا کی زندگی بھی واضح ہوتی ہے، اور تہذیبی معاملات بھی سامنے آتے ہیں۔ ساتھ ہی جغرافیہ پہلو سے بھی صادقہ نواب سحر نے اپنی کہانی کو اہم بنانے کی کوشش کی ہے۔ یوں تو اس افسانے کی کہانی طویل ہے۔ اس میں بنیادی کردار مہادو کا ہے جو مچھیرا ہے۔ بارود کے سہارے وہ مچھلی پکڑتا ہے۔ ایک دفعہ بارود پھینکتے وقت اس کا ہاتھ کٹ جاتا ہے۔ وہ علاج کراتا ہے۔ اس کی زندگی کرب سے گزرتی ہے۔ پھر جب وہ ٹھیک ہوتا ہے تو مچھلی کا شکار کرنے جاتا ہے۔ وہ مچھلی بیچتا تھا تو اس کے گھر میں بکرے کا گوشت بنتا تھا۔ جب وہ اپاہج ہونے کے بعد مچھلی پکڑتا ہے تو وہ بہت خوش ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ پدما کا کردار اہم ہے جو اس کی بیوی ہے اور بہت محنتی ہے۔ یہ افسانہ اس وقت اور زیادہ دل چسپ ہوتا ہے جب مہادو ایک پڑھنے والے لڑکے مدد کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ لڑکا اپنا پرس بھول کر گھر سے نکل جاتا ہے۔ رکشتہ اسٹینڈ کے پاس وڑا پاؤ کھاتا ہے اور چائے پیتا ہے۔ وہ لڑکا ہوٹل والے سے بات کرتا ہے کہ وہ کل پیسے آ کر دے گا مگر ہوٹل والا بدتمیزی کرتا ہے۔ بدتمیزی دیکھ کر مہادو کو رہا نہیں جاتا ہے اور وہ لڑکے کی طرف سے بل ادا کرتا ہے۔ اس واقعے سے کہانی میں اور جان پیدا ہو جاتی ہے۔

صادقہ نواب سحر نے ایک طرف مچھیرے کو دکھایا۔اس کی غریب بیوی کو واضح کیا ہے، پھر مچھیرے کی دلی کیفیت اور انسانیت کو سامنے رکھا۔ان تمام باتوں کی وجہ سے یہ افسانہ خوب صورت ہو جاتا ہے۔اس افسانے میں واقعے کے علاوہ جغرافیہ معاملات بھی واضح ہوتا ہے۔ذیل میں ایک اقتباس دیکھیں:

''ممبئی سے تقریباً سو کلو میٹر کی دوری پر سنٹرل لائن پر لوکل ٹرین کا آخری اسٹیشن کرجت ہے۔کرجت سے پندرہ کلو میٹر دور نسرا پورا گاؤں تینوں طرف ندیوں سے گھرا ہوا ہے۔ایک جانب الہاس ندی دھیمی رفتار سے بہتی ہے اور دوسری جانب پیج ندی کی رفتار زیادہ ہے۔پیج ندی میں خوب مچھلیاں ہوتی ہیں۔نسرا پور کے تیسری جانب یہ دونوں ندیاں ملتی ہیں اور اچھی خاصی رفتار کے ساتھ ہو کر بہتی ہے۔ الہاس ندی سے مل کر پیج ندی اپنا نام کھو دیتی ہے۔''(۱)

اس اقتباس سے ہم انداز کر سکتے ہیں کہ صادقہ نواب نے کس طرح ممبئی کے جغرافیہ کو بیان کیا ہے۔کہانی میں جغرافیہ کشش پیدا کر دیتا ہے اور اس افسانے کو تہذیبی معاملات سے جوڑ دیتا ہے۔اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صادقہ نواب سحر نے اپنے افسانوں میں فقط کہانیوں سے کام نہیں لیا بلکہ انھوں نے تہذیبی بیان اور نفسیات کے سہارے بھی کہانی کو آگے بڑھایا ہے۔

یہاں ہم ان کے ایک نفسیاتی افسانے کا تذکرہ کر رہے ہیں جس میں انھوں نے بچوں کی نفسیات کو انتہائی شان دار طریقے سے پیش کیا ہے۔یہ افسانہ ایک سبق کی حیثیت رکھتا ہے، بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اس افسانے کو نصاب میں شامل کیا جائے، کیوں کہ اس میں درسگاہوں کے لحاظ سے بڑا درس چھپا ہوا ہے۔یہ افسانہ ہے ''سہمے کیوں ہو انکش''۔ چوں کہ صادقہ نواب سحر خود درس و تدریس سے جڑی ہوئی ہیں۔اس لیے انھوں نے تعلیمی پس منظر میں ایک بہترین افسانہ پیش کیا ہے۔ اس افسانے سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''بہت بڑا غلط کام ہوا ہے نہ تجھ سے!......''ممی نے آنکھیں پھاڑیں۔ہاں بہت غلط کام ہوا مجھ سے .. مگر ممی انھوں نے مجھے ننگا کر کے کیوں مارا؟''

وہ تو تمہاری ڈرائنگ پر چاک پھینک رہے تھے نا!..... تمہیں تو چھوا بھی نہیں بیٹا!''نائیں ممی انھوں نے مجھے مارا .... انہوں نے مجھے بہت مارا.....

مسز پاٹل نے محسوس کیا، وہ سر سے پاؤں تک لرز رہا تھا.......!(۲)

یہ افسانہ کچھ یوں ہے کہ انکش ایک اسکول کا طالب علم ہے۔وہ بہت حساس اور ذی شعور طالب ہے۔وہ خود معصوم ہے اور اس کے دل میں بھی ایک معصوم بچہ رہتا ہے۔جس اسکول میں وہ پڑھتا ہے، اس اسکول میں اسی ٹیچر کا بیٹا نیرج بھی پڑھتا ہے۔ نیرج کی تعلیمی لیاقت کیا ہے، اس کا صحیح علم کسی کو نہیں ہوتا ہے۔وہ بھی شرارتی ہے اور انکش بھی شرارتی ہے، مگر دونوں کی شرارت میں فرق ہے۔کیوں کہ انکش شرارت کرتا ہے جو بچے کا حق بھی ہے۔جب کہ نیرج کی ماں اسکول میں پڑھاتی ہے۔ٹیچر ہے تو وہ ہمیشہ آپے سے باہر ہوتا ہے۔بچوں کو پریشان کرتا ہے۔بچوں سے اپنے کام کراتا ہے۔بچے اس کی عادتوں سے پریشان رہتے ہیں۔

نیرج انکش کو بھی پریشان کرتا ہے۔اس سے پانی منگواتا ہے۔گویا کالجوں میں ریگنگ ہوتی ہے مگر جس طرح نیرج کر رہا ہے، وہ بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔اس لیے انکش اس سے بہت زیادہ پریشان تھا۔انکش نے غصے میں آخر کار نیرج کی بوتل میں پیشاب کر دیا ہے۔

اس واقعے کا علم جب نیرج کی امی کو ہوتا ہے تو وہ بچوں سے

بورڈ پر انکش کی تصویر بنواتی ہیں اور بچوں سے کہتی ہیں کہ وہ انکش کو مارے۔ وہ بچے حقیقی طور پر انکش کو مارتے نہیں ہیں بلکہ وہ چاک سے بورڈ پر انکش کو مارتے ہیں۔ اس حال میں کہ انکش کو بورڈ پر ننگا دکھایا گیا ہے۔ اس تصویر اور بچوں کی حرکت سے انکش کو شرمندگی ہوتی ہے، بلکہ حقیقی مار سے کہیں زیادہ اسے چھوٹ لگتی ہے۔

کہانی کا بنیادی پہلو بچے کا ذہن ہے۔ اس سزا سے انکش کے ذہن میں جو نفسیاتی دباؤ پیدا ہوا ہے، وہ قابل ذکر ہے۔ صادقہ نواب سحر نے دبے لفظوں میں تعلیمی اداروں سے یہ کہا کہ بچوں کو ایسی سزا نہیں دی جانی چاہیے۔ دوسری طرف ٹیچر کے بچوں کا رویہ اسکول میں غیر انسانی نہیں ہونا چاہیے۔ صادقہ نواب سحر نے اس افسانے میں نفسیاتی معاملات کو اچھی طرح پیش کیا ہے۔ اس افسانے میں ان کی فن کاری بہت واضح طور پر نظر آتی ہے۔

''الو کا پٹھا'' کالج کی زندگی پر مبنی افسانہ ہے جس میں صادقہ نواب سحر نے لڑکیوں کے معاملات میں ٹیچر اور اسٹوڈنٹ کو بھی منہمک دکھایا ہے۔ اس میں ایک لڑکی سنیہا ہوتی ہے جو اپنے فوجی رشتے دار سے شادی نہیں کرنا چاہتی ہے اور نہ ہی آکاش نامی لڑکے کی طرف مائل ہوتی ہے۔ رام چندرن نامی ٹیچر ہوتے ہیں۔ ٹیچر کے دل میں اس لڑکے کے متعلق خیال ہوتا ہے، مگر وہ لڑکی ٹیچر سے بات کرتی ہے، ہر معاملے کا اظہار خیال کرتی ہے مگر شادی کے متعلق کچھ کہتی نہیں ہے۔ اس تناظر میں ایک اقتباس دیکھیں:

> ''شادی کا پروپوزل بھی شرط جیتنے کے لیے ہی رکھا تھا۔ آسانی سے دام نہیں آ رہی تھی نا، سنا ہے بڑی تیڑھی کھیر تھی وہ۔ اور میں الو کا پٹھا۔ رام چندرن کے منہ سے نکلا۔ اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ چھوٹ کر طشتری میں لڑھک گیا۔ ذرا سی چائے چھلک کر سفید شرٹ کو داغ دار بنا گئی تھی۔'' (۳)

اس افسانے میں تعلیمی نظام کو شامل رکھا گیا ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے، یہاں شادی کے متعلق کیسے خیالات ہوتے ہیں۔ صادقہ نواب سحر نے اس افسانے میں کوئی جانب داری نہیں برتی بلکہ لڑکی کی نفسیات کو پیش کیا ہے اور ساتھ ہی انھوں نے مردوں کے معاملات کو بھی واضح کیا۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے ہر مقام پر عورتوں کی برتری ثابت نہیں کی۔ کہیں وہ عورتوں کے معاملات کو واضح کرتی ہیں، کہیں وہ مردوں کے دہرے رویوں کو واضح کرتی ہیں۔

صادقہ نواب سحر نے جہاں جغرافیائی معاملات کو پیش نظر رکھا، وہیں انھوں نے بچوں کی نفسیات کو واضح کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے عورت کے درد کو بھی پیش کیا ہے۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے مختلف معاملات کو سامنے رکھا ہے۔

''ویل چیئر پر بیٹھا شخص'' ایک بہترین موضوع پر لکھا ہوا افسانہ ہے۔ جس میں درد ہے۔ عورتوں کی ناقابل بیان معاملات کا ذکر ہے۔ اس میں ایک واقعہ یہ ہے کہ سعودی کا ایک فرد ہندوستانی لڑکی سے شادی کرتا ہے۔ یہ واقعہ ہندوستان میں بہت مشہور ہے۔ بہت سے افراد جس طرح ٹکٹ کا کاروبار کرتے ہیں اور ہندوستانی بچوں کو سعودی بھیجتے ہیں، اسی طرح کہ بہت سے لوگ ہندوستانی لڑکیوں سے سعودی کے لوگوں کی شادی کراتے ہیں۔ شائستہ فاخری نے اسی درد کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں بھی سعودی کے فرد سے شادی کا واقعہ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ اس جوڑنے کے درمیان عمر میں برابری نہیں ہے۔ اس لیے یہ شادی اور زیادہ تشویشناک ہو جاتی ہے۔ اس کہانی سے ایک اقتباس دیکھیں:

> ''پھر تم نے اپنے طور پر اقرا کی کسی عرب سے شادی کرانے

کی کوشش کیوں نہیں کی۔

وجہ یہ ہے کہ اب عربی جلدی شادی نہیں کرتے ہیں اور مجھے اس کی شادی کی جلدی تھی۔ دوسرے.....اب ایک تھالسیمیا نامی بیماری سننے میں آتی ہے۔ جسم کا پورا خون بدلنا پڑتا ہے۔ یہ خاندان کے اندر ہی اندر بہت قریبی رشتوں میں نسل درنسل کرنے کا نتیجہ ہوتی ہے۔

پھر عربی آپس میں شادیاں کیوں کرتے ہیں۔ صائمہ سوالات کی بوچھار کیے جا رہی تھی۔ اس لیے تو فلپینوں اور تھائی لنڈی یا انڈین سے شادی کرتے ہیں۔" (۴)

اس اقتباس میں کئی باتیں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ صادقہ نواب سحر کی فن کاری ہمیں متوجہ کرتی ہے اور ان کا مطالعہ بھی ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہاں بنیادی طور پر تین معاملات کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ پہلا یہ کہ اب سعودی والے شادی نہیں کرتے ہیں۔ انڈین عورتوں سے خواہشات پوری کرتے ہیں اور معاوضہ دینا زیادہ آسان سمجھتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ ہے کہ سعودی میں پہلے اپنوں میں شادی کا رواج تھا۔ اپنی رشتے داری میں کئی نسل سے شادی کرنے کا نقصان ہوتا ہے۔ ایک بیماری پیدا ہو جاتی ہے، اس بیماری کی طرف مذکورہ اقتباس میں اشارہ کیا گیا ہے۔ گویا صادقہ نواب سحر فقط افسانہ بیان کرنا نہیں جانتی ہیں بلکہ وہ افسانوں سے تہذیبی معاملات اور میڈیکل کے انکشافات کو بھی ملاتی ہیں۔ یہ افسانہ جہاں عورتوں کے مسائل بیان کرتا ہے، وہیں میڈیکل اور بیماری کے پہلوؤں کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ اس افسانے میں صائمہ، اقرا، حمید، مریم اور اینہ وغیرہ اہم کردار ہیں۔ ایک لڑکی ایسی شادی کے بعد آزادی کچھ یوں آزادی حاصل کرتی ہیں:

"بس ہمت کر کے اپنے گھر کے دروازے سے ایک دن بھاگ نکلی تھی۔ میرا شوہر اس وقت باتھ روم میں تھا۔ نکلا، دیکھا، پیچھا کیا مگر میں امی کے گھر نہیں گئی، سہیلی کے گھر چلی گئی تھی۔ امّی پر کتنے دن بوجھ رہتی۔ بھائی مجھے ہرگز کام کرنے نہیں دیتے۔ اخبار میں واک ان انٹرویو دیکھا اور اب یہاں ہوں۔" (۵)

صادقہ نواب سحر نے اس افسانے میں ایک عورتوں کے مسائل کو بیان کیا ہے۔ اس لیے عورتوں کے دکھ کو بیان کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے روزگار سے جوڑ کر عورتوں کو بااختیار بھی بنایا ہے۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صادقہ نواب سحر اپنے افسانوں کو اکہرا نہیں چھوڑتی ہیں۔ فقط واقعات کے بیان پر اکتفا نہیں کرتی ہیں بلکہ وہ تہذیبی اور معاشی معاملات پر بھی توجہ دیتی ہیں۔ یہ افسانہ درد اور بھوک کا پس منظر بیان کر رہا ہے اور ہمارے اقتصادی معاملات کو بھی واضح کر رہا ہے۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صادقہ نواب کا ایک افسانہ کئی ایک پہلو سامنے لاتا ہے۔ اس افسانے سے مکالمہ کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

کون ہو تم ؟؟.....کون ہو؟؟"، صائمہ نے کچھ ہمت ہمت کر لی اور بالکنی کا سلائیڈنگ ڈور ذرا سا سرکا کر بالکنی میں دیکھا اور اپنے سوال مکمل کیا.... "اور یہاں کیسے آئی ہو؟" "آپ کے پڑوس میں رہتی ہوں اور اپنی بالکنی کی دیوار پھاند کر آئی ہوں۔" سامنے سے بڑی سادگی کے ساتھ جواب ملا۔ پلیز آپ مجھے اپنے گھر میں سے ہو کر جانے دیجیے۔ اس نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

میرے گھر سے؟؟ ...... تم اپنے گھر کے دروازے سے باہر کیوں نہیں نکلیں؟" میرا شوہر بڑا ظالم ہے۔ بہت مارتا ہے مجھے۔ دن بھر مجھے گھر میں بند رکھتا ہے۔ کسی سے ملنے نہیں دیتا۔ تالا لگا کر باہر جاتا ہے۔ آج بھی دروازے پر

باہر سے تالا لگا کر ہی کام پر گیا ہے۔اب پلیز مجھے اندر لے لیجیے۔میں آپ کو بتاتی ہوں نا! چور نہیں ہوں میں! اقراء نام ہے میرا۔(۶)

یہاں دو باتیں ہمیں مائل کر رہی ہیں۔ پہلا شوہر کا ظلم، دوسری طرف عورت کی ہمت۔ کیوں کہ اقرا کیسے بھاگتی ہے اور چھت پھلانگ کر جاتی ہے۔اس طرح یہاں صادقہ نواب اپنے مکالموں سے فقط کہانی کو آگے نہیں بڑھاتی ہے، بلکہ مکالمے میں درد کے پہلو کو بھی شامل رکھتی ہے۔ یہاں ہم محسوس کر سکتے ہیں کہ کس طرح صادقہ نواب نے مکالمہ بیان کیا ہے، جس میں بے ساختگی ہے اور عورت کا درد بھی ہے اور عورت کی قدرت اور طاقت کی کیفیت بھی ہے۔ بلاشبہ صادقہ نواب سحر کا یہ افسانہ ایک شاہ کار افسانہ ہے جس میں افسانے کی بنت بھی ہمیں متوجہ کرتی ہے اور موضوع اہم ہے۔انھوں نے اپنے افسانوں میں ہندوستانی ثقافت کو انتہائی شان دار طریقے سے پیش کیا ہے۔

”ان کی کہانیوں میں ہندوستان کی روح تڑپتی ہوئی دیکھی جاسکتی ہے اور اسی میں ان کا خلوص، وارفتگی، اظہار کی بے ساختگی اور حقیقت نگاری کا راز پنہاں ہے۔“(۷)

بلاشبہ صادقہ نواب سحر نے اپنے افسانوں میں ہندوستانی معاملات کو پیش کیا ہے۔ظاہر ہے ہندوستانی تہذیب وسعت رکھتی ہے۔اس وسعت میں ممبئی اور اس کے اطراف کا علاقہ بھی شامل ہوتا ہے ۔ شائستہ فاخری نے ممبئی کی تہذیب کو بہترین طریقے سے پیش کیا ہے۔

ہم نے صادقہ نواب کے ایسے افسانوں کو اس مضمون میں منتخب کیا ہے جن میں بچے، عورت، جغرافیہ، حالات، غریبی، ہمدردی وغیرہ کا تناظر ابھر کر سامنے آئے۔اوپر بھی ایسے افسانے شامل ہیں جن میں تہذیبی معاملات ہیں اور ذیل میں بھی ”ہزاروں خواہشیں ایسی...“ افسانہ پیش کیا جاتا ہے۔جس میں عورتوں کی ایک محکومی والی تصویر سامنے آتی ہے۔اس میں عورتوں کی خواہشات کی پروا نہیں کی جاتی بلکہ یہ دکھایا گیا کہ عورت کو مرد کے تابع رہنا چاہیے۔اس افسانے میں لڑکا زید ہے جس کی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔شادی کے بعد زید سے کہا جاتا ہے کہ زید کا خیال رکھا کرو۔ اس کی خواہشوں کا احترام کرو۔اس تناظر میں یہ اقتباس دیکھیں:

”زید بڑا شوقین لڑکا ہے۔کلبوں پارٹیوں میں جانے کا بھی شوق ہو تو عجب نہیں۔آج کل دنیا ایسے ہی لوگوں کو ماڈرن کہتی ہے۔شادی کے بعد اس کا ہر کام اپنے ہاتھوں سے کرنا۔خدمت اور محبت سے ہی دل جیتا جاسکتا ہے۔اس کے کپڑے ہمیشہ تیار رہیں۔چیزیں سلیقے سے اپنی جگہ پر رہیں۔ جوتے ہمیشہ ایک روز پہلے پالش کر کے رکھ دیا کرو۔اور ہاں شادی کے بعد شوہر ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ اس کی بات پر اپنا سب کچھ قربان کرنا۔کوئی شکایت نہ سنوں وہ جیسا کہے ویسا ہی کرنا، ناچنے کہے ناچنا، گانے کہے گانا۔“(۸)

اس افسانے میں ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ شوہر کی خواہش کی نہیں، بلکہ اس کے تمام تر معاملات کا خیال رکھنا بیوی کے لیے لازمی ہے۔گویا عورت بیوی نہیں ہوتی ہے، وہ شریک حیات نہیں ہوتی ہے، بلکہ وہ خادمہ ہوتی ہے۔گویا اس میں ہم زمانۂ قدیم کی تہذیب کو محسوس کر سکتے ہیں۔صادقہ نواب سحر نے زمانۂ قدیم کے معاملات کو اکیسویں صدی سے جوڑا ہے۔یہی سبب ہے کہ یہ افسانہ قابل ذکر ہو جاتا ہے۔وہ اس طرح کہ ہم آج ترقی کر رہے ہیں مگر ہماری ذہنیت ترقی نہیں کر پا رہی ہے۔

الغرض صادقہ نواب سحر فنی خصوصیات کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہیں۔انھوں نے فن کاری کا مظاہرہ کیا ہے۔اس ضمن

میں ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''صادقہ نواب۔سحر کے افسانوں کی زبان بہت دلکش ہے۔ ان کے جملے تراشیدہ ہیں۔عورتوں کی زبان پر بھی انھیں مہارت حاصل ہے۔ انسان کی اخلاقی، معاشی، معاشرتی اور ذہنی زندگی کے اکثر گوشوں کو موصوفہ نے اپنے افسانوں میں مکمل تصویر کشی کی ہے۔ان کا مشاہدہ گہرا ہے۔''(۹)

بلاشبہ صادقہ نواب سحر کی زبان میں تخلیقی عناصر موجود ہیں۔انھوں نے کرداروں کے لحاظ سے مکالمے تراشے ہیں اور تہذیبی معاملات کو نگاہوں میں رکھا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے افسانوں میں ہم کوئی اجنبی دنیا محسوس نہیں کرتے ہیں۔

بلاشبہ صادقہ نواب سحر کے افسانے ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔انھوں نے متنوع موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ انھوں نے عورت کی نفسیات کا جائزہ لیا ہے۔ساتھ ہی انھوں نے عورتوں کو اندر سے مضبوط کرنے کی کوشش کی ہے۔اگر صادقہ نواب سے افسانوں کی کل تعداد پر بات کریں تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے تقریباً ڈھائی درجن افسانے تحریر کیے ہیں ۔ ان افسانوں میں فقط فلسفے نہیں دی ہے، بلکہ انھوں نے جہاں فلسفے معاملات کو واضح کیا ہے، وہیں جغرافیہ کے معاملات کو بھی سامنے رکھا ہے۔ان کے مکالموں میں ایک طرح سے بے ساختگی پائی جاتی ہے۔صادقہ نواب سحر کے افسانوں میں کہیں افہام و تفہیم کی پریشانی نہیں ہوتی ہے۔انھوں نے سیدھے سادھے جملوں میں معاملات زندگی کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔صادقہ نواب سحر کے افسانوں میں ممبئی کے اطراف واضح ہوتے ہیں۔اس طرح ہم یہ کہہ سکتے کہ ان کے افسانوں نے دیہی اور شہری مسائل یکساں طور پر ملتے ہیں۔انھوں نے اپنی زبان میں علاقی الفاظ کو شامل رکھا ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے علاقائی زبان میں مکالمے لکھنے کی کوشش کی ہے۔ان کے ایسے مکالموں کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے دیہی مکالموں کا اردو میں ترجمہ بھی پیش کیا ہے۔ اس لیے ان کے افسانوں میں ہر سطح کے قارئین کے لیے بہت کچھ موجود ہے۔انھوں نے علاقائی اثرات سے اپنے افسانوں کو مبہم بننے نہیں دیا ہے۔ یہ بھی ان کی فن کاری ہے۔

حوالے:

(۱) صادقہ نواب سحر، بیچ ندی کا مچھیرا، 2018، ص104

(۲) صادقہ نواب سحر، سہمے کیوں ہو انکش، مشمولہ: بیچ ندی کا مچھیرا، 2018، ص19

(۳) صادقہ نواب سحر، الو کا پٹھا، مشمولہ: بیچ ندی کا مچھیرا، 2018، ص127

(۴) صادقہ نواب سحر، وہیل چیئر پر بیٹھا شخص، مشمولہ: بیچ ندی کا مچھیرا، 2018، ص29

(۵) صادقہ نواب سحر، ویل چیئر پر بیٹھا شخص، مشمولہ: بیچ ندی کا مچھیرا، 2018، ص30

(۶) صادقہ نواب سحر، وہیل چیئر پر بیٹھا شخص، مشمولہ: بیچ ندی کا مچھیرا، 2018، ص21

(۷) پروفیسر میر تراب علی یدالہی/محمد اسلم، صادقہ نواب سحر: شخصیت اور فن'' مرتبین، 2017، ص:616۔

(۸) صادقہ نواب سحر، ہزاروں خواہشیں ایسی، مشمولہ: خلش بے نام سی، 2013، ص90

(۹) وفیسر میر تراب علی یدالہی/محمد اسلم، صادقہ نواب سحر: شخصیت اور فن'' مرتبین، 2017، ص: ص49

☆☆☆

سید عظمت اللہ بیابانی۔ وجئے نگر کالونی، حیدرآباد

بدلتے رُخ

موسم گرما ہے، عصر کے بعد کا وقت، سورج اپنی جلالت کے اظہار کے بعد تھکا تھکا اپنی آرام گاہ کی طرف خراماں خراماں بڑھ رہا ہے، گرم ہوا بھی منڈلا رہی ہیں۔ لوگ اپنے مکانوں کے صحن میں پانی چھڑکتے نظر آرہے ہیں۔ میرے دوست شہر سے چھٹیاں منانے ہمارے گاؤں بچوں سمیت آرہے ہیں۔

بلدیہ کا ایک چھوٹا سا خوبصورت پارک ہے، ایک طرف اونچے ستونوں پر بنی ہوئی پانی کی ٹینک ہے، ہمہ اقسام کے پودے اپنی بھینی بھینی خوشبو پھیلاتے ہوئے اس گرم ہوا میں ایسے مچلا رہے ہیں جیسے کوئی نازنین فیشن شو کے اسٹیج پر اپنی رنگ برنگی اور انیک لباسوں میں سجی تھرک رہی ہیں، میں اپنے پرانے دوست جو شہر سے آئے ہیں اُن کے افرادِ خاندان کے ساتھ پارک آیا ہوا ہوں۔ ایک ایسی جگہ جہاں بالکل اندھیرا بھی نہ ہو اور زیادہ روشن بھی ہو کا انتخاب کیا اور ہم نے وہاں پڑاؤ ڈالا، میں چونکہ دوست کا قدیم شناسائی ہوں پھر بھی اُن کے ساتھ میں زنانہ ہونے کے ناطے کچھ دور بیٹھا ان کی باتیں سننے میں زیادہ دقت محسوس نہیں کر رہا تھا۔

دائیں طرف جب میری نگاہ پڑی پھولوں سے لدے کئی قسم کے پودے اپنی نازک بیلیں سر اوپر اٹھائے ہوئے ایسے بل کھاتے ہوئے نظر آرہے ہیں جیسے کہ کوئی نازنین اپنی نازک کمر مٹکاتے ہوئے نظر آرہی ہیں۔ میں نے دیکھا اِن نازک اور شرمیلی پھولوں سے لدی شاخوں کو جب ہم اپنے احاطہ میں لیتے ہیں تب اُن کی لہلہاتی ہوئی کمر اور بل کھائی ہوئی ادائیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اِن نازک اور نئی نویلی پھولوں والی شاخ مرجھا بھی جاتی ہیں۔ اِن ٹہنیوں کی بقا بالکل ہی مختصر حالانکہ اِن کی خوبصورتی چھلانگ لگاتے ہوئے غیروں کے دیدوں کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔

اور جب میں اپنی بائیں طرف نظر کرتا ہوں تب دیکھتا ہوں کہ کچھ پھول ایسے دلکش ہیں کہ قریب جا کر گلچیں بننے کی تمنا غالب آتی ہے لیکن اُس کے قریب جانے سے رکنا پڑتا ہے کیوں کہ درمیان میں کچھ ایسی آڑ ہے جس کو پار کرنا آسان نہیں۔ شیطانی وسوسہ دل میں ہونے کے ناطے میں نے اُس کے قریب تک پہنچ گیا اور گلچیں کی شخصیت مجھ پر حاوی ہوگئی۔ پھول بہت ہی خوبصورت ہیں لیکن اُس کے پاس کانٹے اُس کے محافظ بنے پھول کی حفاظت کر رہے ہیں۔ جب پھول شاخ سے جدا کرکے میں نے ہاتھ جب اوپر اٹھانے کی کوشش کی تب اس پھول کے پاسبان کانٹے میری آستین کو پکڑ کر روکنے کی کوشش کر رہے ہیں اور میں نے محسوس کیا کہ ''ابھی نہ جاؤ چھوڑ کے'' اس شاخ کی بہادری پر نظر کی جائے جس میں سپہ سالاری کی قوت اپنے بچ بچاؤ کی طاقت اور قوتِ ارادہ مخفی ہے۔

کچھ دیر میں سوچ میں پڑ گیا کہ وہ جو نازک اور نئی نویلی پھولوں والی پتلی کمر والی بیل کتنی جلدی مرجھا جاتی ہے جو اپنی اور ہماری بانہوں میں آسانی سے آجاتی ہے لیکن صرف چندہ اوقات کے لئے جب کہ یہ تند خو خاردار مضبوط جسم والی شاخ کا

پھول جیسے ہم اپناتے ہیں اُس کی بقا کافی حد تک بڑی ہے۔ میں اسی سوچ میں پڑا ہوا تھا کہ میرے دوست کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی، وہ مجھے قریب بلا رہے تھے، جب میں اُن کے قریب پہنچا، انہوں نے اپنی لڑکی کو بلا کر کہنے لگے، یہ اس کے ماموں کی طرف سے اس کے باپ کی پیدائش کے دن کی مبارکباد سنا رہی ہے۔اس لڑکی کے ماموں کسی قریب کے شہر میں برسر روز گار ہیں۔ شاید اُن کو اتنا وقت بھی نہ ملا ہوگا کہ وہ آتے اور اپنے بزرگ والدین کی خدمت میں حاضر ہو کر دعا لیتے۔ والدین کا اثاثہ اُن کی عمروں کے لحاظ سے شکل بدلتا رہتا ہے، کبھی سکّوں کی شکل میں کبھی جائیداد کی شکل میں تو آخر میں دعاؤں کی شکل میں۔ وہ وقت گزر گیا جب اولاد گھر سے باہر نکلتی تب والدین کی دعا لیکر نکلتے تھے۔ اب دعاؤں کی جگہ دواؤں کی پیاکٹ لیتے ہوئے نکلتے ہیں۔ اس حیثیت کو بدلتے ہوئے بچوں کو ایک زمانہ لگ جاتا ہے کہ وہ اس کو یاد کر سکیں۔ میں نے دیکھا جب لڑکی اپنے ماموں کی طرف سے دی ہوئی مبارکبادی سنا رہی تھی، میرے دوست کی آنکھوں میں موتی جیسے قطرے پلکوں کی چلمن سے بہت ہی احتیاط سے نکل رہے ہیں، وقت اندھیرے میں تبدیل ہوتا گیا۔

ستارے میرے دوست کی نا قابل بیان حالت پر تعجب سے دیکھ رہے ہیں، میرے دوست سے میں چونکہ زمانے سے جانکاری رکھتا ہوں، وہ ہمیشہ ہر چھوٹی بڑی خوشی کا اظہار اپنے عزیز واقاریب کے ساتھ کرتا ہے اور شامل افراد کو دعاؤں سے اور انعامات سے نوازتا ہے۔ اب شاید وقت ایسا نہیں ہے۔ لوگ آن لائن اپنے کلمات پہنچا دیتے ہیں۔ اس میں نہ کسی قسم کا لمس ہوتا ہے نہ جسامیت نہ احترام کی کیفیت اور نہ کسی قسم کا خلوص۔ اب ہم پارک سے گھر کی طرف لوٹ چلے۔

فہیم اختر۔لندن، برطانیہ

نظم

نیل کے نام

نیل کو جوش کیسا آیا ہے
بہتی گنگا کو اب لبھایا ہے

نیل وگنگا میں مشترک ہے یہی
کتنی امیدوں کو بہایا ہے

آج، گنگا فریفتہ تجھ پر
اس کو، تو نے ہی تو بلایا ہے

تجھ کو تاریخ کا پتا ہی نہیں
تو نے فرعون کو مٹایا ہے

سن لے، کہتا ہے یہ فہیم اختر
تیری عزت پہ حرف آیا ہے

☆☆☆

ڈاکٹر نادر المسدوسی۔صدر بزم علم وادب حیدرآباد

پروفیسر خواجہ عمر کی علمی، ادبی، تعلیمی خدمات ناقابل فراموش

''رہبر طلبہ'' کتاب کی رسم اجراء، صدر جلسہ ومہمانان خصوصی کا اظہار خیال

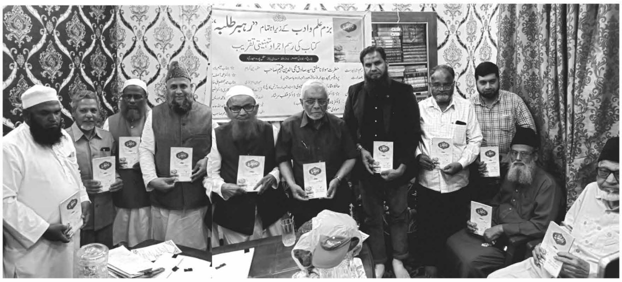

پروفیسر خواجہ عمر کی 85 برس کی عمر میں 53 ویں کتاب'' رہبر طلبہ'' کے ساتویں ایڈیشن کی رسم اجراء پروفیسر مجید بیدار (سابق صدر شعبہ جامعہ عثمانیہ) کے ہاتھوں مسدوسی ہاؤس مغلپورہ میں عمل میں آئی۔ تقریب کا آغاز قاری حافظ ڈاکٹر نصیر الدین منشاوی کی قرأت کلام اور مولوی حافظ محمد ادریس مصباحی کی نعت شریف سے ہوا۔ افتتاحی وخیر مقدمی کلمات میں مولوی عبداللہ حامد رشادی (ناظم مدرسہ تعلیم البنات محبوب نگر) نے صدر جلسہ پروفیسر مجید بیدار (سابق صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ) مہمانان خصوصی ڈاکٹر سید اسلام الدین مجاہد (سابق اسوسی ایٹ پروفیسر سیاسیات) ڈاکٹر نصیر الدین منشاوی (استاذ شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ)، ڈاکٹر ناظم علی (سابق پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج موڑتاڑ، نظام آباد)، ڈاکٹر محمد آصف علی (ایگزیکٹیو ڈائرکٹر روبی چینل) ڈاکٹر نادر المسدوسی (صدر بزم علم وادب) اور نامور شاعر انجینئر حلیم بابر کے علاوہ مہمانان اعزازی میر محتشم علی خان (سلور میڈلسٹ) کا ان کی خدمت میں چند کلمات کے ساتھ تعارف کرواتے ہوئے خیر مقدم کیا۔ اس با مقصد تقریب رسم اجراء کو صدر جلسہ، مہمانان خصوصی اور مہمان اعزازی کے مخاطب کرتے ہوئے مصنف کتاب مولوی پروفیسر خواجہ عمر کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا کہ انہوں 1960ء سے تعلیمی میدان میں ایک ٹیچر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے ہوئے اسوسی ایٹ پروفیسر کے مقام تک ترقی کی منازل طے کی ہیں جہاں سیکڑوں طلبہ کو تعلیم کے زیور سے تلنگانہ کے مختلف اضلاع میں آراستہ کرتے رہے ہیں وہیں انہوں نے 52 نصابی کتابوں کو مرتب کیا اور یہ ان کی 53 ویں تصنیف رہبر طلبہ ہے جو نہ صرف طلبہ کی رہبری کرتی ہے بلکہ اساتذہ کے لئے بھی بے حد مفید کتاب ہے۔ اس کتاب کو ہر اسکول اور مدرسہ کے تعلیمی نصاب میں شامل کرنا چاہئے۔ تاکہ نہ صرف صحیح اردو سے بلکہ اخلاق وکردار کی اعلیٰ ترین صفات حیات سے آگہی ہو اور ایک شریف النفس نیک، ہمدرد، ملنسار، غم گسار انسان بن کر قوم وملت کی مخلصانہ خدمات انجام دینے والے بنے۔ اس موقع پر حافظ محمد ریاض احمد (زیڈ نیوز چینل)، محمد فصیح الدین انصاری (انجینئر)، محمد سہیل (خازن جمیعۃ العلماء) محمد عبدالخالق شکیل (انجینئر) محمد تمیز الدین احمد (صحافی) ودیگر نے شرکت کی اور مصنف کو مبارک باد پیش کی۔ آخر میں مفتی سید صادق محی الدین فہیم نے دعا فرمائی۔ مصنف کتاب خواجہ عمر نے سبھی شرکاء سے محفل کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض حافظ وقاری محمد مصطفیٰ نے انجام دیئے۔ احمد با مسدوس نے انتظامات میں حصہ لیا۔

ماہر شبلیات ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

’شبلی ایوارڈ‘ سے سرفراز

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی ’شبلی ایوارڈ‘ حاصل کرتے ہوئے۔

تصویر میں (دائیں سے بائیں) پروفیسر علاء الدین خاں، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی اور ڈاکٹر ظفر الاسلام دیکھے جاسکتے ہیں۔

عالمی شہرت یافتہ ادارہ دارالمصنفین کے کانفرنس ہال میں منعقدہ ایک تقریب میں معروف اسکالر ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کو شبلیات پر گراں قدر خدمات کے اعتراف میں پہلا ’’شبلی ایوارڈ‘‘ تفویض کیا گیا۔ پروگرام کا آغاز حافظ قمر عباسی کی تلاوت قرآن مجید سے ہوا۔

اس موقع پر دارالمصنفین کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں نے ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کو شال، توصیفی سند اور پچاس ہزار روپے نقد پر مشتمل ایوارڈ سے سرفراز کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں خوشی ہے کہ ہم نے ایسی شخصیت کی تکریم کی ہے جس نے علم کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ انھوں نے علامہ شبلی پر جس قدر کتابیں لکھی ہیں اس سے زیادہ کسی بھی شخصیت پر نہیں لکھی۔ انھوں نے علامہ شبلی کی حیات وخدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس پُر آشوب دور میں ایک بار پھر علامہ کے مشن پر کام کرنے کی ضرورت ہے کیوں کہ اس وقت ہمیں مستشرقین کے ساتھ جھوٹوں کا سامنا ہے، اس کا واحد حل علامہ کے مشن پر کام کرنے میں مضمر ہے۔

دارالمصنفین کے سینئر رفیق مولانا عمیر الصدیق دریا بادی ندوی نے کہا کہ میں نے سیکڑوں جلسوں کی صدارت ونظامت کی ہے لیکن آج جس قدر مسرور ہوں کبھی نہیں تھا۔ ہمارے درمیان جو شخصیت موجود ہے وہ کبھی اسی شبلی اکیڈمی میں خوشخط سیکھنے آئے تھے، آج وہ بین الاقوامی شخصیت کے

مالک ہیں۔انھوں نے یہ مقام اپنی محنت سے حاصل کیا ہے۔ علامہ پر 36 کتابیں لکھنا شبلی سے ان کے عشق کی دلیل ہے۔

دارالمصنفین کے رفیق کلیم صفات اصلاحی نے ڈاکٹر موصوف کا مفصل تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ دار المصنفین کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے جب یہاں کسی اسکالر کو شبلی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا ہے۔ڈاکٹر صاحب کی اب تک چھوٹی بڑی کل 62 کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں سے تین درجن کتابیں صرف علامہ شبلی پر لکھی گئی ہیں۔

شبلی ایوارڈ سے سرفراز ہونے کے بعد ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے جذباتی انداز میں ارباب دارالمصنفین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میں اس لائق نہیں تھا، یہ میرے بزرگوں کی ذرہ نوازی ہے۔انھوں نے کہا کہ علم وادب کے تعلق سے ہمارا ماضی غیر معمولی رہا ہے لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس وقت اس سمت میں کوئی جدوجہد نہیں ہو رہی ہے، کبھی کبھی موجودہ صورتِ حال پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔میں چاہتا تھا کہ یہاں سے وہ کام ہو جس کے لیے علامہ شبلی نعمانی نے اس ادارے کو قائم کیا تھا کیوں کہ موجودہ زمانے میں اس کی اہم ضرورت ہے۔انھوں نے اکیڈمی کے تمام ذمہ داران کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ایوارڈ کے ساتھ ملنے والی نقد رقم کو اکیڈمی کی نذر کرنے کا اعلان کیا اور کہا کہ طالب علمی کے دوران میں نے محسوس کیا کہ علامہ شبلی کی شخصیت ہمہ جہت ہونے کے باوجود بھی نصابوں میں انھیں وہ مقام نہیں دیا گیا جس کے وہ حقدار تھے۔چناں چہ میں نے شبلیات پر تحقیق اور الگ الگ جہتوں سے ان کو متعارف کرانے کے لیے جان کی بازی لگادی اور نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی نے ڈاکٹر موصوف کی زندگی کو نوجوانوں کے لیے نمونہ قرار دیتے ہوئے ان کو علامہ شبلی نعمانی کے تعلق سے مزید کام کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔

اس موقعے پر اراکین دارالمصنفین کے علاوہ اعظم گڑھ پبلک اسکول کے منیجر محمد نعمان، ڈاکٹر ابو رافع، مرزا محفوظ بیگ، جاوید احمد، محمد ہشیم نعمانی اور غفران احمد سمیت معززین شہر بڑی تعداد میں موجود تھے۔

☆☆☆

DR. S.J HUSSAIN
MD (Unani)
Former director Incharge
Central Research Institute Of Unani Medicine
Govt of India

website: www.unanicentre.com
Email:syedjalilhussain@gmail.com
jaleel_hussain@yahoo.com

Dr. Jaleel's

یونانی سینٹر فار کارڈیک کیر
UNANI CENTER FOR CARDIAC

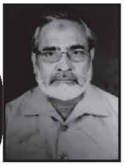

Consultation Time
Morning: 9:00 am to 2:00 pm
(Friday Morning and Sunday Evening Closed)

Cell:
+91 8142258088
+91 7093005707

Adress -: No: 8-1-332/3/B-69, RoadNo 1(A)Arvind Nagar Colony
Tolichowk Hyderabad - 500008 T.S India

شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ، حیدرآباد

SHIBLI INTERNATIONAL
EDUCATIONAL & CHARITABLE TRUST

SIECT

Regd. No. 180/2016

مدرسہ و مسجد کے تعاون کی اپیل

حدیث نبوی ﷺ ہے خَیرُکُم مَن تَعَلَّمَ القُرآن وَعَلَّمَہ۔ تم میں بہترین انسان وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔ اس حدیث سے علم اور قرآن علم کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسی علم کی نشر و اشاعت کے لئے **مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم** ۱۵؍ جنوری ۲۰۱۷ء کو قائم کیا گیا تا کہ امت مسلمہ کے نونہالان زیور علم سے آراستہ ہوں اور ملک و ملت کی خدمت میں وقف ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے۔ آمین یا رب العلمین۔

مدرسہ ہذا کی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے۔ جملہ اخراجات کی ادائیگی اہل خیر حضرات کے تعاون سے ہوتی ہے۔

الحمدللہ مدرسہ میں تعمیری کام بھی جاری ہے، اس وجہ سے اہل خیر حضرات سے گذارش ہے کہ مدرسہ کا نقد یا اشیاء کے ذریعہ تعاون فرما کر یا کسی طالب علم کی کفالت لیکر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔ نوازش ہوگی۔

مسجدِ الٰہی

زیر انتظام شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ حیدرآباد کا تعمیری کام جاری ہے۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ ایک مخیرّہ خاتون نے 126 گز اراضی ٹرسٹ ہذا کو مسجد کے لئے وقف کیا ہے، اللہ تعالیٰ مخیرّہ کو دونوں جہاں میں بہترین بدلہ دے، آمین۔ مسجدِ الٰہی کی زمین مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم وادیٔ عمر شاہین نگر حیدرآباد کا (اقامتی و غیر اقامتی) ادارہ ہے، جو شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ کے زیر انتظام 2017 سے خدمات انجام دے رہا ہے، بالکل اسی سے متصل ہے۔ مدرسہ ہذا اور بستی کے لئے مسجد ناگزیر ہے، اس وجہ سے آپ تمام حضرات سے گزارش کی جاتی ہے کہ مسجد ہذا کے تعمیری کام میں نقد یا اشیاء کے ذریعہ معائنہ کر کے حصہ لے کر ثوابِ دارین حاصل کریں۔

جزاک اللہ خیرًا احسن الجزاء.

Bank Name : IDBI **A/c Number :** 1327104000065876
A/c Name : SHIBLI INTERNATIONAL EDUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST
IFSC Code : IBKL0001327. Branch: Charminar
G Pay & Phone Pay : 8317692718, WhatsApp: 9392533661

العارض: حافظ و قاری مفتی ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی خطیب مسجد عالیہ، بانی و ناظم مدرسہ ہذا چیرمین شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد

Urdu Monthly
SADA E SHIBLI
Hyderabad

July 2024 جولائی

RNI: TELURD/2018/77022
ISSN: 2581-9216
Rs. 20/-

S.No.: 22-1-114, Jambagh, Kali Khabar Main Road, Dar-ul-shifa, Hyderabad - 500 024, TS
Off.: 5-3-989, 104, First Floor, Sherza Estates, N.S. Road, M.J. Market, Hyderabad - 500 095
email: kgnteasales@gmail.com

Editor, Printer, Published & Owned by Mohd. Muhamid Hilal
Printed at Daira Electric Press, #22-8-143, Chatta Bazar, Hyderabad. 500 002.
Published at #17-3-352, B1, 2nd Floor, Bafana Complex, Dabeerpura, Hyderabad - 23, T.S
Cell: 9392533661, 8317692718, Email: muhamidhilal@gmail.com